

۱۷-۲۴ جنوری ۱۹۷۴ء

ایک جائزہ

پاک چین تعلقات

کراچی ٹیلی ویژن پر" بھ[illegible] شو



عیرتِ ضبط کو جی بھر کے پشیماں کریں
پھونک کر آج تو گھر ہم بھی چراغاں کر لیں

اب نہ مچلیں گی دردِ دل پہ سلونی یادیں
آ غمِ زیست تجھے جزو رگِ جاں کر لیں

اس طرف زخمِ تمنا اور ادھر منظرِ دار
کس کو اپنائیں کسے بے سروساماں کر لیں

آپ دیجئے نہ بہاروں کو ابھی اذنِ خرام
پہلے ہر غنچے کو ہم خوگرِ حرماں کر لیں

گر نہیں آج تو کل ہو گا مکافاتِ عمل
آپ دل کھول کے ہر شہر کو ویراں کر لیں

اب کسے پرسشِ احوال کی فرصت مقبولؔ
آئیے درد کو منت کشِ درماں کر لیں

مقبول قریشی

فاروق احمد فاروق

زخمِ سفر

پھر وہی ناوکِ دشنام وہی راہگذر
پھر وہی سنگِ ملامت وہی اشکوں کے گہر

پھر وہی دِل میں سر بار خیالوں کے ہجوم
پھر وہی چاکِ گریباں وہی خونابِ جگر

کس طرح زندگی میں اپنی گزاروں یارب
چارسُو رقصاں ہے آزردہ خیالوں کا فسُوں

تہہ بہ تہہ بیٹھ گئی دِل پہ مرے گردِ اَلم
اپنی بربادی کا اظہار میں اب کس سے کروں

جن سویروں کو مداوائے الم ٹھہرا کر
رات کے درد کو ہنس ہنس کے سہا تھا میں نے

وہ سویرے بھی نہ اس درد کے درماں ہونگے
اس سے پہلے کبھی سوچا بھی تو نہ تھا میں نے

وہ جن کو ہمدم و ہمراز اپنا سمجھا تھا
وہ جن کے واسطے دُنیا لُٹا کے آئے تھے

خبر نہ تھی کہ وہی خُونِ دِل سے کھیلیں گے
وہ جن کے واسطے ہستی مِٹا کے آئے تھے

مرے دمساز ہی ٹھہرے ہیں مرے موجبِ غم
نجانے کتنے زخم لگائے ہیں بہ اسمِ اللہ

خدا کی بستی کے مظلوم
عوام کا ترجمان

ایڈیٹر
وہابؔ صدیقی

۱۷ - ۲۴ جنوری ۱۹۷۴ء
قیمت ۵۰ پیسے
ہوائی ڈاک سے ایک روپیہ

ہفت روزہ
الفتح
جلد ۴ شمارہ ۳۶

اداریہ

افواہوں کے ہتھیار

بینکوں کو قومی ملکیت میں لینے کے اعلان کی دیر تھی کہ افواہوں کا ایک ختم نہ ہونے والا سلسلہ شروع ہو گیا۔ پہلا وار یہ تھا کہ حکومت سونے کو قومی ملکیت میں لے رہی ہے اور موجودہ کرنسی کے سو اور پچاس روپے کے نوٹ منسوخ کیے جا رہے ہیں جکومت نے بروقت یہ اعلان کیا کہ یہ خبریں غلط، بے بنیاد اور لغو ہیں تو دوسرا تیر چلا دیا گیا کہ حکومت نے نئے نوٹ چھپوائے ہیں۔ پاک ڈالر یا پھر ریال پاکستان کی کرنسی ہوگی۔ اس پر طرہ یہ کہ ان کے حق میں دلائل جاری کیے جا رہے ہیں اور پھر کہا جاتا ہے کہ یہ ہوا تو سو روپے کے نوٹ کے بدلے اتنے پیسے کم ملیں گے۔ نتیجہ یہ نکل رہا ہے کہ جو لوگ ان پڑھ ہیں یا افواہوں کی تصدیق نہیں کرتے، وہ ان کی باتوں میں آ جاتے ہیں اور سو اور پچاس روپے کے نوٹ قبول کرنے سے انکار کر دیتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ بنکوں کو قومیانے سے بڑے سرمایہ دار اور اُن کے ایجنٹوں پر براہ راست زد پڑی ہے۔ یہ کام بڑی احتیاط سے کیا گیا ہے، اُس سے اِس طبقے میں شدید بوکھلاہٹ پھیل گئی ہے اور وہ زخمی درندے کی طرح اپنا آخری وار کرنا چاہتا ہے۔ اُن کا اصل مقصد یہ ہے کہ ملک میں افراتفری پھیلے، بے چینی بڑھے اور اس طرح وہ اپنے سیاسی مقاصد حاصل کر سکیں۔ کرنسی کا بحران کسی بھی ملک کی معیشت کے لیے سب سے زیادہ نقصان دہ ثابت ہوتا ہے اور جب رائج سکے پر سے صارفین کا اعتماد اُٹھ جائے تو یہ بحران اپنی بدترین شکل اختیار کر لیتا ہے۔

خاص مضامین

سرورق ۵ انور سمیع

فون ۴۱۲۲۷۴

ارشاد راؤ پبلشر نے حقی آفسٹ پریس لیاقت آباد سے چھپوا کر دفتر ہفت روزہ الفتح ۷-۸ ڈی نرسری کمرشل ایریا پی ای سی ایچ ایس کراچی ۲۹ سے شائع کیا

۱۹۷۱ء سے لے کر اب تک پاکستان، سیاسی، اقتصادی اور خارجی بحرانوں میں پھنسا ہوا ہے۔ ۱۹۷۱ء کی جنگ کے نتیجے میں ملک کا بڑا حصّہ الگ ہوگیا۔ اس جنگ نے جہاں اخلاقی پستی کو جنم دیا وہاں معاشی ابتری بھی پیدا ہونا ایک فطری امر تھا۔ بین الاقوامی مارکیٹ کے دباؤ کے تحت رُوپے کی قیمت کم ہوئی۔ تیل کی قیمت میں اضافے نے اقتصادی رفتار پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ اندرونی اور بیرونی انتشار براہِ راست کرنسی پر اثر انداز ہوا۔ یہ وجوہات پاکستان میں مالی بحران کو تقویت پہنچانے کے لیے کم نہ تھیں کہ سرمایہ دار طبقے نے اپنے اثاثے غیر ممالک میں منتقل کرنے شروع کر دیے۔ مزدوروں کو اُن کے حقوق سے محرُوم کیا اور صنعتی بے چینی پیدا کر کے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ مزدُور تشدّد پر اُتر آیا ہے اور اس بے چینی کے پس منظر میں کسی خفیہ طاقت کا ہاتھ ہے۔ نوکر شاہی نے اپنے روایتی کردار سے کام لیا اور گولیوں کی زبان استعمال کی، جس کے نتیجے میں صنعتی بدامنی اور بڑھی۔ یہ دو طرفہ تماشا تھا۔ ایک طرف سرمایہ دار اپنے اثاثے غیر ممالک میں منتقل کر رہا تھا اور دُوسری طرف وہ صنعتی پیداوار کا پہیّہ جام کرنے میں مصروف تھا، وہ منصُوبہ بندی کے تحت معیشت کو تباہ کرنا چاہتا تھا۔

حکومت اور سرمایہ داروں کے درمیان سرد جنگ دُو سال سے جاری تھی۔ حکومت ہلکی سی ضرب لگاتی تو وہ جوابی کارروائی میں مصروف ہو جاتے۔ آخر حکومت کو بنک قومیانے پڑے۔ یہ خاصی شدید ضرب تھی، سرمایہ دار اب افواہ سازی کے ذریعے اس کا جواب دے رہا ہے۔

حکومت اس محاذ پر صرف عوام کے بل بوتے پر ہی فتحیاب ہو سکتی ہے۔ ذرائع نشر و اشاعت ابھی تک سرمایہ داروں کے زیرِ اثر ہیں۔ وہ اپنا طبقاتی کردار ادا کرنے پر مجبُور ہے۔ موجودہ حکومت ایک سیاسی جماعت کی پیداوار ہے۔ اُسے نوکر شاہی پر دارومدار کی پالیسی بالآخر ترک کرنا پڑے گی اور تمام تر انحصار اُن عوام پر کرنا پڑے گا جنہوں نے پیپلز پارٹی کو ووٹ دیے۔ اس کے منشور میں بنکوں کو قومیانا شامل ہے۔ حکومت کا فرض ہے کہ وہ اپنی اس پالیسی کی افادیت سے ہر شہری کو آگاہ کرے۔ پارٹی کے کارکنوں کو اس سے متعلق لٹریچر مہیا کیا جاتے۔ اس میں تاخیر سے کام لیا گیا تو قومیائے جانے والے بنکوں میں پہلے سے موجود سرمایہ داروں کے ایجنٹ سبوتاژ کرنے سے باز نہیں آئیں گے۔ بعض بنکوں میں یہ کھلم کھلا تاثر دیا جا رہا ہے کہ یہ اقدام ملک کے مفاد کے منافی ہے اور صرف اتنا ہوا ہے کہ بنکوں کے ملازم پہلے سیٹھ کے تنخواہ دار تھے، اب وہ سرکاری کارندے بن گئے ہیں۔

حکومت کو اس ضمن میں ٹھوس کام کرنا ہوگا۔ بنکوں کے وائٹ پیپر شائع کیے جائیں اور عوام کو بتایا جائے کہ کس طرح عوام کے سرمائے کو لُوٹ کر اجارہ داریاں قائم کی گئیں۔ سرمایہ داروں پر بنکوں کے قرضوں کی کتنی رقوم واجب الادا ہیں اور وہ ان بنکوں سے کس طرح کروڑ پتی اور ارب پتی بنے۔ افواہوں کو صرف عمل اور سچائی کے ذریعے ہی ختم کیا جا سکتا ہے۔ افواہیں پھیلانا لاکھ جرم سہی، لیکن اس جُرم کے تحت آج تک کسی کو عبرتناک سزا نہیں ملی۔





سندھ کابینہ کی تاخیر سے گروہی اختلافات منظرِ عام پر آگئے

احوال واقعی

واقفِ حال

۱۷ فروری تک مرکزی کابینہ میں ردّوبدل کے امکانات

۱۰ جنوری کو کراچی کینٹ اسٹیشن پر وزیرِ اعلیٰ سندھ جناب غلام مصطفیٰ جتوئی نے از راہِ مذاق اخبار نویسوں سے کہا تھا "وزیروں کے نام سن کر آپ حیران رہ جائیں گے"۔ ۱۲ جنوری کو یہ مذاق ایک حقیقت کی صورت میں سامنے آیا۔ تمام اخباری اندازے اور قیاس آرائیاں غلط ثابت ہوئیں۔ سندھ کابینہ کے جن پانچ ارکان نے حلف اُٹھایا، اُن میں سے تین غیر متوقع تھے۔ اور واقعی اُن کے نام سُن کر اخبار نویس حیران رہ گئے۔

۱۰ جنوری کو وزیرِ اعلیٰ سندھ نے کہا تھا کہ "سندھ کی کابینہ کے چھ ارکان ۱۲ جنوری کو حلف اٹھائیں گے" لیکن ۱۲ جنوری کو صرف پانچ ارکان، عبدالوحید کٹپر، جام صادق علی، میر ہزار خان بجرانی، پیار علی الانا اور بشیر احمد شاہ نے حلف اٹھایا۔ کابینہ کے چھٹے رکن کے لئے احمد علی سومرو کا نام لیا جا رہا تھا کیونکہ وہ غیر متنازعہ اُمیدوار تھے اور اُنہیں پاکستان پیپلز پارٹی سندھ کے تمام گروپوں کی حمایت حاصل تھی۔ کہا جاتا ہے کہ ۱۱ جنوری کو سرکاری طور پر اُنہیں اطلاع دی گئی کہ وہ کل حلف اُٹھا رہے ہیں۔ چنانچہ اُس رات اُن کے گھر پر بڑا ہجوم تھا۔ یار احباب جمع تھے۔ رات کو محفلِ طرب بھی سجائی گئی۔ دوسرے دن حلف برداری کے موقع پر وہ گورنر ہاؤس بھی پہنچے۔ لیکن وزارت کا دروازہ اُن پر نہ کھل سکا۔ اِسی دن مسٹر جتوئی نے بتایا کہ عنقریب مزید دو وزیر کابینہ میں لئے جائیں گے اور چند ماہ کے بعد دو اور ارکان کابینہ میں شامل کئے جائیں گے۔

سندھ کی نئی کابینہ کے سینئر وزیر عبدالوحید کٹپر ہیں، اس وقت یہ صوباتی اسمبلی کے رکن نہیں ہیں، ان کے لئے لاڑکانہ کے نواب محبوب مگسی نے صوباتی اسمبلی کی رکنیت سے استعفیٰ دے دیا ہے، کہا جاتا ہے کہ عبدالوحید کٹپر کو وزیر اِس لئے بنایا گیا ہے۔ کہ انہوں نے لاڑکانہ پیپلز پارٹی کے لئے کافی کام کیا تھا۔ اور ان کی خدمات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، اگر انہیں وزارت نہیں دی جاتی تو کوئی دوسرا اہم عہدہ دینا ضروری تھا۔ وہ سندھ کی سیاست میں اب ایک باا ثر گروپ کے نمائندے ہیں۔

جام صادق علی کا تعلق سانگھڑ سے ہے، کہا جاتا ہے کہ سابق وزیرِ اعلےٰ سندھ جناب ممتاز بھٹو ان کے مخالف ہیں۔ ان کی خواہش تھی کہ جام صاحب کو نئی کابینہ میں شامل نہیں کیا جاتے۔ اسی لئے وزیرِ اعظم اور چیئرمین پاکستان پیپلز پارٹی مسٹر ذوالفقار علی بھٹو نے انہیں لاڑکانہ بلوایا تھا۔ بعض حلقوں کا کہنا ہے کہ جام صادق علی کو وقتی طور پر وزیر بنایا گیا ہے، چند ماہ کے بعد انہیں رخصت کر دیا جاتے گا۔ بشرطیکہ پیر آف پگاڑو شریف سے پیپلز پارٹی کی گفت و شنید ہو جاتے۔

جیکب آباد کے میر ہزار خاں بجرانی پہلی مرتبہ سیاست کے افق پر نمودار ہوتے ہیں، ۱۱ جنوری کو ہی



ممتاز بھٹو بدستور سندھ کی سیاست پر چھائے ہوئے ہیں

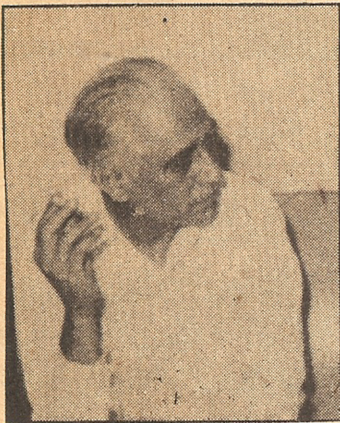
یہ پاکستان پہنچے ہیں۔ ان کے باپ سردار نور محمد بجرانی حیدر آباد سے سندھ اسمبلی کے رکن ہیں۔ جواب اپنے بیٹے کے حق میں صوباتی اسمبلی کی رکنیت سے استعفیٰ دے دیں گے۔

پیار علی الانا کا تعلق پاکستان مسلم لیگ (قیوم گروپ) سے ہے، وہ نوجوان، ذہین اور باصلاحیت شخص ہیں۔ لیکن یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ سندھ کی اسمبلی میں پاکستان پیپلز پارٹی کی واضح اکثریت ہونے کے باوجود قیوم لیگ کے رکن کو صوباتی کابینہ میں کیوں شامل کیا گیا۔ کیا اس مرتبہ سندھ کابینہ نے مرکزی کابینہ کی پیروی کی ہے؟ یا پیپلز پارٹی کے ارکان اسمبلی میں پیار علی الانا صاحب جیسا کوئی ذہین اور باصلاحیت فرد نہیں تھا۔ بشیر احمد شاہ کا تعلق ٹھٹھہ سے ہے، کہا جاتا ہے کہ انہیں جناب ممتاز بھٹو کی حمایت حاصل ہے، رہا یہ سوال کہ نئے وزیر کس حد تک اپنی ذمہ داریاں پوری کرنے کی اہلیت رکھتے ہیں۔ اس کا فیصلہ مستقبل کرے گا۔

پاکستان پیپلز پارٹی کے کنونشن سے قبل عام خیال یہ تھا کہ حاجی قاسم عباس پٹیل کو نئی کابینہ میں ضرور شریک کیا جائے گا۔ کیونکہ انہوں نے پیپلز پارٹی کے لئے بہت کام کیا ہے، جسے پارٹی نظرانداز نہیں کر سکتی تھی۔ لیکن کنونشن میں جب جناب قاسم پٹیل تقریر کرنے کھڑے ہوتے تو مندوبین نے ان کی تقریر سننے سے انکار کر دیا۔ شور مچایا اور زبردست ہوٹ کیا۔ اس واقعہ کے بارے میں جناب قاسم پٹیل کے قریبی حلقوں کا کہنا ہے کہ انہیں ہوٹ ایک منظم اور سوچے سمجھے منصوبے کے تحت کیا گیا ہے۔ بعض حلقوں کا کہنا ہے کہ پرانی کابینہ کے آخری دور میں جناب ممتاز بھٹو اور حاجی قاسم عباس پٹیل کے درمیان اختلافات پیدا ہو گئے تھے۔ چنانچہ مسٹر ممتاز بھٹو نے انہیں دوبارہ کابینہ میں شامل کرنے کی مخالفت کی۔ یہی وجہ ہے کہ انہیں لاڑکانہ بلوایا گیا، مگر مذاکرات ناکام رہے۔

وزیر اعلےٰ سندھ مسٹر غلام مصطفےٰ جتوئی نے ۲۴ دسمبر کو اپنے عہدے کا حلف اٹھایا تھا۔ عام طور پر وزیر اعلےٰ کے حلف اٹھانے کے دو گھنٹے کے بعد ہی نئی کابینہ کا اعلان کر دیا جاتا ہے، اور وہ اگلے دن حلف اٹھا لیتی ہے، لیکن موجودہ کابینہ کی تشکیل میں غیر ضروری تاخیر سے کام کیا گیا۔ جس کا عوام پر اچھا اثر مرتب نہیں ہوا۔ عام تاثر یہ تھا کہ پیپلز پارٹی میں پھوٹ پڑ گئی ہے گروہی سیاست چل رہی ہے۔ اور ہر گروپ اپنے آدمیوں کو برسر اقتدار لانا چاہتا ہے۔ ہر پارٹی میں مختلف گروپ ہوتے ہیں۔ کم از کم دو گروہ ضرور ہوتے ہیں۔ دائیں اور بائیں، لیکن گروہی سیاست اور آپس کے اختلافات کو پوشیدہ رکھا جاتا ہے۔ اسے منظر عام پر نہیں لایا جاتا۔ لیکن سندھ کی نئی کابینہ کی تشکیل میں تاخیر کی وجہ سے تمام اختلافات منظر عام پر آ گئے، لوگوں کا کہنا ہے کہ پنجاب میں تو کسی حد تک پارٹی کے مختلف گروہوں میں ہم آہنگی ہے، لیکن سندھ میں اختلافات کی خلیج بہت وسیع ہو چکی ہے۔

جب مسٹر جتوئی کو سندھ کابینہ کا وزیر اعلیٰ بنایا گیا، تو عام خیال یہ تھا کہ یہ غیر متنازعہ شخصیت ہیں۔ سندھ پیپلز پارٹی کے تمام گروہوں کے متفقہ امیدوار ہیں۔ اور جب میر رسول بخش تالپور نے مسٹر جتوئی کے اعزاز میں ہونے والی تقریبات میں شرکت کی تو اس خیال کو مزید تقویت پہنچی، اس لئے امکان تھا کہ نئی کابینہ میں پیپلز پارٹی کے تمام گروہوں کے نامزد امیدواروں کو لیا جائے گا۔ لیکن نئی کابینہ میں میر رسول بخش تالپور کے



ملک معراج خالد

نامزد افراد، محمد خاں سومرو، نواب نبی بخش بھرگڑی اور ذکیہ بروہی میں سے کسی کو نہیں لیا گیا۔ نئے وزیروں کی اکثریت ممتاز بھٹو کے نامزد افراد پر مشتمل ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ گو جناب ممتاز بھٹو برسر اقتدار نہیں لیکن آج بھی وہ سندھ کے سیاسی افق پر چھائے ہوتے ہیں۔

وفاقی کابینہ میں ردّوبدل کے امکانات

وفاقی کابینہ میں ردّوبدل ہونے والی ہے۔ وزیر اعظم بھٹو نے اس سلسلے میں صلاح مشورے شروع کر دیئے ہیں۔ امید ہے کہ یہ تبدیلیاں ۷ فروری تک کر لی جائیں گی۔ پیپلز پارٹی کے قریبی حلقوں کا کہنا ہے کہ معراج خالد، ملک محمد اختر اور جمعیت العلمائے اسلام کے مولانا عبدالحکیم کو وفاقی کابینہ میں شامل کیا جائے گا۔ وفاقی وزیر ایندھن و معدنیات جناب محمد خاں شیرپاؤ کو سرحد کا وزیر اعلیٰ اور وفاقی وزیر زراعت غوث بخش رئیسانی کو بلوچستان کا وزیر اعلیٰ بنایا جائے گا، کیونکہ یہ صوباتی اسمبلی کے رکن ہیں۔

پاک چین تعلقات
ایک جائزہ

وہاب صدیقی

چین اور پاکستان کی خارجہ پالیسی
پنچ شیلا پر مبنی ہے !

چین پاکستان سے

اسلحہ سازی اور صنعتی منصوبوں میں اشتراک کریگا

۶ جنوری کو عوامی جمہوریہ چین کا ایک فوجی وفد پاکستان کے ۱۲ روزہ دورہ پر راولپنڈی پہنچا۔ وفد کے قائد، چین کے عوامی سپاہِ آزادی کے ڈپٹی چیف آف جنرل اسٹاف کامریڈ چانگ ژائے چین ہیں۔ چینی فضائیہ کے وائس کمانڈر بھی وفد میں شامل ہیں۔ چین کے فوجی وفد کے دورے کی اہمیت کا اندازہ اِس بات سے لگایا جاسکتا ہے۔ کہ اگرچہ اِس سے قبل چین کے فوجی وفود پاکستان کا دورہ کرتے رہے ہیں۔ لیکن اِس سے قبل وفد میں اتنے اعلیٰ حکام شامل نہیں ہوتے تھے۔ اِس کے علاوہ یہ وفد اِس موقع پر آیا ہے۔

جب کہ امریکہ نے پاکستان کو فوجی امداد دینے سے انکار کر دیا ہے۔ اور پاکستان فرانس کے اشتراک اور خلیج کی عرب ریاستوں کے سرمائے سے اسلحہ ساز فیکٹریاں لگانے کا منصوبہ بنا رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مغربی ممالک چینی فوجی وفد کے دورے کو بہت اہمیت دے رہے ہیں۔ بی بی سی کی اطلاع کے مطابق چین، پاکستان، فرانس اور خلیج کی عرب ریاستوں کے اسلحہ سازی کے مشترکہ پروگرام میں مدد دینے پر غور کر رہا ہے۔ اور اِس سلسلے میں فنی امداد دینے کو تیار ہے۔ بی بی سی کے مطابق پاکستانی فضائیہ میں چینی مگ ۱۹، امریکی سیبر طیاروں کی جگہ لے رہے ہیں۔ اور عنقریب چینی مگ پاکستانی فضائیہ کے اہم جزو بن جائیں گے۔ چین نے پاکستان کو ٹینک، طیارہ شکن توپیں اور لڑاکا کشتیاں بھی دی ہیں۔ وفد کے قائد کامریڈ چانگ ژائے چین نے اپنے دورہ کے دوران متعدد بار چین کے فوجی تعاون کا یقین دلایا ہے۔

۸ جنوری کو صنعتی ترقیاتی کارپوریشن مغربی پاکستان کے چیئرمین ایس۔ آر۔ آفریدی نے بتایا کہ حکومت پاکستان نے صوبہ سرحد میں پانچ نئے ٹیکسٹائل ملز قائم کرنے کیلئے عوامی جمہوریہ چین کی حکومت سے امداد کی درخواست کی ہے۔ یہ کارخانے ڈیرہ اسماعیل خان، ہنگو، کرک اور تربیلا میں تعمیر کئے جائیں گے۔

ان واقعات سے ثابت ہوتا ہے۔ کہ حکومت پاکستان صرف امریکی امداد پر بھروسہ اور انحصار کرنے کی بجائے دوسرے ممالک سے بھی رجوع کر رہی ہے۔ فرانس اور خلیج فارس کی عرب ریاستوں کے اشتراک سے اسلحہ ساز فیکٹریاں قائم کرنے کا منصوبہ، سوویت یونین کی مدد سے کراچی کے اسٹیل ملز کا پلان، چینی فوجی وفد کی آمد اور چین کو سرحد میں ٹیکسٹائل ملز لگانے کی پیش کش اسی سلسلے کی مختلف کڑیاں ہیں۔ چین سے فوجی اور صنعتی امداد حاصل کرنے کا منصوبہ ایک اچھا اقدام ہے۔ کیونکہ چین پاکستان کا سب سے مخلص دوست ہے۔ اور اس نے ہر موقع پر پاکستان کی حمایت کی ہے۔ یہ سامراج اور نوآبادیاتی نظام



چانگ ژائے چین — فوجی حکمت عملی کے ماہر

چین کے فوجی وفد کے سربراہ کامریڈ چانگ ژائے چین عوامی سپاہ آزادی کے ڈپٹی چیف آف جنرل اسٹاف ہیں۔ وہ عوامی سپاہ آزادی کے ایک آزمودہ کار فوجی ہیں اُن کا شمار چین کی فوجی حکمتِ عملی کے ماہرین میں ہوتا ہے۔ کامریڈ چانگ ژائے چین نوعمری ہی میں عوامی فوج آزادی میں شامل ہوگئے تھے۔ اُنہوں نے جنگ آزادی کے دوران چیئرمین ماؤزے تنگ کی قیادت میں لانگ مارچ میں حصہ لیا اور کئی فوجی مہمات کی قیادت کی۔ کامریڈ چانگ نے ۱۹۲۷ء سے ۱۹۳۷ء تک خانہ جنگی اور ۱۹۳۷ء سے ۱۹۴۵ء تک جاپان کے خلاف جنگِ مزاحمت میں حصہ لیا ■





پاک بحریہ
کے
وائس ایڈمرل
ایچ ایچ احمد
چینی
فوجی وفد
کے قائد
چانگ ژائے چھینی
کا
استقبال کر
رہے ہیں



چائنا کے تعاون سے پاکستان نا قابل تسخیر قلعہ بن جائے گا

کا سب سے بڑا دشمن ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پاکستان اور دیگر ترقی پذیر ممالک جو سامراجی غلامی کا طوق اپنے گلے سے اتارنا چاہتے ہیں۔ چین کو اپنا دوست سمجھتے ہیں۔ اور اس کی خارجہ پالیسی کو پسند کرتے ہیں۔

عوامی جمہوریہ چین کی خارجہ پالیسی کی بنیاد "پنچ شیلا" ہے۔ خارجہ تعلقات کے یہ اصول بنڈونگ کانفرنس میں مرتب کئے گئے تھے، چین کی خارجہ پالیسی کی بنیادی اور اساسی اصولوں میں کہا گیا ہے۔

و ہمارا یہ پختہ موقف ہے کہ تمام اقوام کو پانچ مشہور اصولوں (پنچ شیلا) پر عمل کرنا چاہیئے یعنی ایک دوسرے کی خودمختاری، علاقائی یکجہتی کا احترام، باہمی مفاد اور پُرامن بقائے باہمی، یہی اقوام کے تعلقات کا معیار ہے ۶

جو ملک "دو چین کے نظریہ" کو تسلیم نہ کرتا ہو، تائیوان کو چین کا اٹوٹ انگ سمجھتا ہو۔ عوامی جمہوریہ چین اُس ملک کا ایک مخلص دوست ہے۔ اور اُس کی دوستی لازوال ہے۔

چین اور پاکستان کے درمیان دو ہزار سال پرانے روابط ہیں جب کہ شاہراہِ ریشم کے راستے قافلے چین سے پاکستان آتے تھے۔ دونوں کے درمیان تجارتی تعلقات تھے۔ لیکن ۱۸۵۷ء کے بعد برطانوی نوآبادکاروں کی رکاوٹوں، اور تخریبی کارروائیوں کی وجہ سے یہ روابط قائم نہ رہ سکے۔ ان ہی دیرینہ تعلقات کی بنا پر انقلاب چین کے تین ماہ کے بعد ہی پاکستان نے عوامی جمہوریہ چین کی حکومت کو تسلیم کر لیا۔ لیکن پاک چین تعلقات اور دوستی کی استواری میں دو واقعات نے بڑا اہم کردار ادا کیا۔

۱۹۴۹ء میں برطانیہ نے اسٹرلنگ کی قیمت گرا دی۔ بھارت نے بھی اپنی کرنسی کی قیمت کم کر دی۔ لیکن پاکستان نے اپنے سکے کی قیمت برقرار رکھی۔ بھارت نے دباؤ ڈالا کہ پاکستان بھی اپنی کرنسی کی قیمت میں کمی کرے۔ لیکن پاکستان نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا۔ اُن دنوں پاکستان پٹ سن اور کپاس بھارت کو برآمد کرتا تھا۔ پاکستانی پٹ سن کا سب سے بڑا خریدار بھارت تھا۔ بھارت سے کوئلہ اور سوتی کپڑا درآمد کیا جاتا تھا۔ چنانچہ بھارتی حکمرانوں نے پاکستان پر دباؤ ڈالنے کی غرض سے کوئلہ دینے سے انکار کر دیا۔ ایسے نازک وقت میں جب کہ پاکستان کی معیشت تباہ ہونے والی تھی، چین نے دوستی کا ہاتھ بڑھایا اور پاکستانی پٹ سن اور کپاس کے عوض کوئلہ دے کر پاکستان کو بھارت کے ناجائز دباؤ سے نجات دلائی۔

پھر کوریا میں جنگِ آزادی شروع ہوئی۔ امریکی سامراج نے حریت پسندوں کو کچلنے کے لئے اپنی فوجیں اِس جنگ میں جھونک دیں۔ اس کے جواب میں چین نے اپنے رضاکار کوریا بھیجے۔ اِن رضاکاروں میں چیئرمین ماؤ کا بیٹا بھی شامل تھا۔ جو اِس جنگ میں شہید ہو گیا۔ جب امریکی سامراج کو کوریا میں مار پڑنے لگی تو اُس نے "جمہوریت کے تحفظ" اور "عالمی امن" کی دہائی دی۔ اقوامِ متحدہ نے امریکہ کے دباؤ کے تحت کوریا میں فوجی دستے بھیجنے کا فیصلہ کیا۔ لیکن پاکستان نے اپنی فوج بھیجنے اور امریکی سامراج سے اشتراک کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ اور جب اقوامِ متحدہ میں چین کو، "جارحیت پسند" قرار دینے کی قرارداد پیش کی گئی تو پاکستان نے رائے شماری میں حصہ نہیں لیا۔

اقوامِ متحدہ میں چین کے داخلے کیلئے کوششیں

عوامی جمہوریہ چین کا قیام یکم اکتوبر ۱۹۴۹ء کو عمل میں آیا۔ سوویت یونین اور مشرقی یورپ کے دیگر سوشلسٹ

سے سفارتی تعلقات استوار کرنے میں پس وپیش سے کام نہیں لیتا۔ وہ "پنچ شیلا" پر کاربند ممالک سے سفارتی تعلقات قائم کرنے کو تیار رہتا ہے۔ چنانچہ چیئرمین ماؤزے تنگ نے کہا ہے۔

و ہمیں دوسرے ممالک سے سفارتی تعلقات بڑھانے چاہئیں۔ جن کی بنیاد علاقائی یکجہتی کے احترام، خودمختاری، مساوات اور باہمی مفادات پر ہونی چاہیئے۔ ان تمام ممالک کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا جائے۔ جو عالمی امن کے لئے آپس میں ایکدوسرے سے تعاون پر آمادہ ہوں ۶

چین اور پاکستان کی دوستی کی بنیاد یہی اصول ہیں۔ چین نے دوستی اور رفاقت کے ان اصولوں کا ہمیشہ احترام کیا جب کبھی پاکستان پر کوئی آزمائشی گھڑی آئی۔ پاکستان کے خلاف مسلح جارحیت کی گئی تو چین نے آگے بڑھ کر دوستی کا حق ادا کیا۔ اور ثابت کیا کہ وہ پاکستانی عوام



چین کا فوجی وفد، گورنر سندھ بیگم رعنا لیاقت علی کے ہمراہ

پاکستان نے کوریا کی جنگ میں اپنے فوجی دستے بھیجنے سے انکار کر دیا

ملکوں نے فوراً چین کی نئی حکومت کو تسلیم کر لیا۔ لیکن امریکی سامراج اور اُس کے حواریوں نے چیانگ کائی شیک کی حکومت کو جو چین کے ایک مختصر سے ٹکڑے فارموسا تک محدود تھی، چینی عوام کی نمائندہ اور قانونی حکومت قرار دیا۔ اِس کی وجہ یہ تھی کہ واشنگٹن، چین کو سوویت یونین کے زیرِ اثر سمجھتا تھا۔ اور اُسے امید تھی کہ چین، ماسکو کے نقشِ قدم پر چلے گا۔ چنانچہ امریکی سامراج کی خارجہ پالیسی کا خالق جان فاسٹر ڈلس لکھتا ہے۔

"چین کے ۴۵ کروڑ عوام ایک ایسی قیادت کی گود میں جا گرے ہیں جو امریکہ کی سخت دشمن ہے اور اپنی رہنمائی اور راہِ عمل ماسکو سے حاصل کرتی ہے۔ منچوریا، منگولیا اور سنکیانگ کے شمالی علاقوں پر سوویت یونین کا سیاسی کنٹرول ہے۔ یہ علاقے معدنیات سے مالا مال ہیں، اگر سوویت یونین چینی عوام کی افرادی قوت کو بروئے کار لایا۔ تو وہ ان معدنی وسائل کی بدولت صنعتی اور معاشی میدان میں بڑی ترقی کر جائے گا۔ اب سوویت کمیونزم کو جرمنی کے دریائے ایلب سے لے کر چینی سمندر تک ستر کروڑ افراد اور لامحدود قدرتی معدنی وسائل سے افادہ کرنے کا موقع مل گیا ہے۔ (بحوالہ "جنگ یا امن" صہ ۱۴۷)

امریکی سامراج پہلے ہی ماسکو کے بڑھتے ہوئے اثر و رسوخ اور سوشلزم کی مقبولیت سے ہراساں اور خائف تھا۔ اُس نے "جمہوریت کی بقا اور تحفظ" "فرد کی آزادی" جیسی اصطلاحات کا سہارا لے کر فارموسا کو دھڑا دھڑ فوجی امداد دینی شروع کر دی۔ فوجی معاہدے کئے۔ فارموسا کے فوجی معاہدے کے سامنے سیٹو اور سنٹو کوئی حقیقت نہیں رکھتے۔ فارموسا کو اقوام متحدہ کے "پانچ بڑوں" میں شامل کر کے عوامی جمہوریہ پر اقوام متحدہ کے دروازے بند کر دیئے گئے۔ دراصل امریکہ اِس غلط فہمی کا شکار تھا، کہ چینی عوام سوشلزم اور چینی کمیونسٹ پارٹی کی حکومت کے خلاف بغاوت کر دیں گے۔ چنانچہ عوامی جمہوریہ چین کی اقوام متحدہ میں شمولیت کے بارے میں جان فاسٹر ڈلس لکھتا ہے:-

"اگر کمیونسٹ چین کی حکومت اپنی حاکمیت منوانے میں کامیاب ہو جاتی ہے تو اقوام متحدہ میں نمائندگی

اِس کا حق بنتا ہے۔ مگر ایک حکومت جو خانہ جنگی کے ذریعے قائم ہوئی ہے، اُسے اُس وقت تک تسلیم نہ کیا جائے جب تک کہ وہ ایک مناسب مدت میں اپنے وجود کو تسلیم نہیں کروالیتی" (بحوالہ "جنگ یا امن" صہ ۱۹۰)

جب پہلی مرتبہ اقوام متحدہ میں چین کی رکنیت کا سوال اٹھایا گیا۔ تو پاکستان نے چین کے داخلے کی حمایت کی، پاکستان کے وزیر خارجہ مسٹر ظفر اللہ خان نے اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی میں اِس مسئلہ پر تقریر کرتے ہوئے کہا۔

"جو وفد اسمبلی میں چین کی نمائندگی کر رہا ہے۔ کئی ماہ قبل چین کے وسیع علاقے پر سے اس کی حاکمیت ختم ہو گئی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ جنرل اسمبلی اِس حقیقت کو تسلیم نہیں کرنا چاہتی۔ وجہ یہ نہیں کہ وہ حقیقت سے آگاہ نہیں ہے بلکہ جنرل اسمبلی کی اکثریت اِس حقیقت کو تسلیم کرنا نہیں چاہتی۔ (بحوالہ "پاکستان اور اقوام متحدہ" از کے۔ سرور حسن)

واشنگٹن اور اُس کے حواری، اقوام متحدہ میں چین کے داخلے کی مخالفت اِس لئے بھی کرتے تھے کہ چین "بڑی طاقت" اور "چھوٹی طاقت" کی اصطلاحات پر یقین نہیں رکھتا، اُس کا کہنا ہے کہ بین الاقوامی سطح پر تمام ممالک ایک جیسے ہیں۔ کیونکہ وہ خود مختار اور آزاد ریاستیں ہیں۔ ۷، اگست ۱۹۷۱ء کو حکومت چین نے اعلان کیا۔

"دنیا کے تمام ممالک خواہ بڑے ہوں یا چھوٹے، دونوں میں مساوات ہونی چاہیئے۔ دنیا کے مختلف ممالک پر اثر انداز ہونے والے مسائل تمام ملکوں کی مشترکہ گفت و شنید سے حل ہونے چاہئیں۔ بڑی طاقتوں کی اجارہ داری نہیں ہونی چاہیئے۔ یہ بین الاقوامی تعلقات کے بنیادی اصول ہیں۔ جن پر تمام ممالک کو عمل کرنا چاہیئے" (پیکنگ ریویو نمبر ۳۳-۱۹۷۱ء)

جب چین ایٹمی طاقت بن گیا تو سامراجی ممالک بھی اُس کے وجود کو تسلیم کرنے لگے۔ ۱۹۷۱ء کے اوائل تک اقوام متحدہ کے ۱۲۴ ملکوں میں سے ۶۳ نے چین کے ساتھ سفارتی تعلقات قائم کر لئے۔ اکتوبر ۱۹۷۱ء میں اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی میں چین کو اقوام متحدہ کا رکن بنانے کے لئے قرارداد پیش کی گئی۔ امریکی سامراج کی شدتِ مخالفت کے باوجود یہ قرارداد منظور کر لی گئی۔ اقوام متحدہ کا رکن بننے سے چین کی توقیر میں تو کوئی اضافہ نہیں ہوا۔ البتہ اِس اقدام سے اقوام متحدہ کی ساکھ میں ضرور اضافہ ہوا۔

پاک امریکی فوجی معاہدے اور چین کا رویہ

جب پاکستان نے امریکہ سے دو طرفہ فوجی معاہدے کئے اور سیٹو، سنٹو میں شمولیت اختیار کی، تو سوویت یونین نے اپنی ناراضگی کا اظہار کیا۔ لیکن چین نے اِس سلسلے میں کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ اور جب پاکستان کے وزیرِ اعظم نے



مسٹر بھٹو، چینی وزیر اعظم چو این لائی سے مصروفِ گفتگو ہیں۔

چو این لائی نے متنازعہ علاقے سری نگر کا دورہ کرنے سے انکار کر دیا

چین کو یقین دلایا کہ "اگرچہ پاکستان فوجی معاہدے کا رُکن ہے۔ لیکن وہ چین کے خلاف کسی کارروائی میں حصّہ نہیں لے گا"۔ تو چینی حکومت نے اِس پر اعتبار کر لیا۔ وزیرِ اعظم چو این لائی نے اپریل ۱۹۵۵ء میں بنڈونگ کانفرنس میں تقریر کرتے ہوئے کہا:۔

"پاکستان کو اِس اَمر کا کوئی خطرہ نہیں کہ چین اُسکے خلاف جارحیت کرے گا۔ پاکستان کے وزیرِ اعظم نے یقین دلایا ہے کہ اگر امریکہ نے فوجی معاہدے کے تحت کوئی جارحانہ کارروائی کی یا عالمی جنگ چھیڑی تو پاکستان اُس میں شریک نہیں ہوگا۔ جیسے کہ وہ کوریا کی جنگ میں شامل نہیں ہوا تھا"

مسئلہ کشمیر اور حکومتِ چین

سوویت یونین کے وزیرِ اعظم مارشل بلگانن نے بھارت کا دورہ کیا تو اُنہوں نے کشمیر کو بھارت کا "اٹوٹ انگ" قرار دے دیا۔ اِس کے برعکس چین نے بھارتی موقف کی کبھی بھی حمایت نہیں کی۔ اُس زمانے میں بھی حمایت نہیں کی جب چین اور بھارت کے تعلقات بہت خوشگوار تھے۔ اور "چینی ہندی بھائی بھائی" کے نعرے لگائے جاتے تھے۔ ۱۹۵۶ء میں چین کے وزیرِ اعظم چو این لائی نے بھارت کا دورہ کیا۔ بھارتی حکمرانوں نے پوری کوشش کی کہ چو این لائی بھی مارشل بلگانن کی طرح کشمیر کو بھارت کا اٹوٹ انگ قرار دیدیں۔ لیکن چو این لائی نے ایسا بیان دینے سے انکار کر دیا۔ اور کہا کہ مسئلہ کشمیر کو کشمیری عوام کی خواہشات کے مطابق گفت و شنید کے ذریعے حل کیا جائے۔ انہوں نے سرینگر کا دورہ کرنے سے انکار کر دیا۔ کیونکہ وہ متنازعہ علاقہ تھا۔ اسکے بعد چینی وزیرِ اعظم نے سری لنکا کا دورہ کیا۔ چین اور سری لنکا کے وزیرِ اعظموں کے مشترکہ اعلامیہ میں پاکستان اور بھارت سے کہا گیا کہ دونوں ممالک پُرامن اور باہمی بات چیت سے مسئلہ کشمیر کو حل کریں۔ ۱۹۶۰ء میں چین کا ایک وفد چین اور بھارت کی سرحدیں متعین کرنے کے لئے نئی دہلی گیا۔ چینی وفد کے اراکین نے سنکیانگ اور کشمیر کی سرحد کے بارے میں یہ کہہ کر بات کرنے سے انکار کر دیا کہ "کشمیر متنازعہ علاقہ ہے۔ بھارت کو اِس کی سرحدیں طے کرنے کا کوئی اختیار نہیں"۔ اِس کے علاوہ چینی حکومت نے متعدد بار کشمیری عوام کے حق خود مختاری کی حمایت کا اعلان کیا۔

لیکن پاکستان کے حکمرانوں نے چین کی دوستی کا جواب گرم جوشی سے نہیں دیا۔ چین کی تمامتر حمایت کے باوجود حکومتِ پاکستان نے سرد مہری برتی، صرف تجارتی سطح پر تعلقات رہے۔ حسین شہید سہروردی کے بعد کسی اور وزیرِ اعظم، یا صدر نے چین کا دورہ کرنے کی زحمت گوارہ نہیں کی، بلکہ ایوب خان نے "شمال سے خطرہ" محسوس کیا اور "شمالی خطرہ" سے نمٹنے کے لئے بھارت کو مشترکہ دفاع کی پیشکش کی، ۲۴ اپریل ۱۹۵۹ء کو ایوب نے مشترکہ دفاع کی تجویز پیش کرتے ہوئے کہا۔

"بیرونی حملے کی صورت میں ہندوستان اور پاکستان، دونوں کو آپس میں قریب آجانا چاہیئے اور مِل جُل کر برصغیر کا دفاع کرنا چاہیئے" (فرینڈز ناٹ ماسٹرز)

حالانکہ حکومتِ پاکستان اِس اَمر سے بخوبی واقف تھی کہ چین سے کوئی خطرہ نہیں۔ بلکہ بھارت توسیع پسندی کی ہوس میں اندھا ہو کر لداخ، نیفا اور تبت کا علاقہ ہڑپ کرنا چاہتا ہے حالانکہ پنڈت نہرو تبت پر چین کی حاکمیت تسلیم کر چکے تھے۔ اُنہوں نے بھارتی پارلیمنٹ سے خطاب کرتے ہوئے کہا تھا۔

"میرے علم میں گذشتہ چند صدیوں میں کوئی زمانہ ایسا نہیں گذرا، جب کسی بیرونی ملک نے تبت پر چین کی فرمانروائی یا اُس کی بالادستی کو جھٹلایا ہو۔ اِس تمام عرصے میں چین خواہ کمزور تھا یا طاقتور اور خواہ اُس کی کوئی سی بھی حکومت رہی ہو اُس نے تبت پر اپنی حاکمیت کے دعویٰ کو ہمیشہ قائم رکھا.....

سلطنتِ برطانیہ نے لارڈ کرزن کے زمانے میں اپنا تسلط تبت تک وسیع کر لیا۔ اور وہاں کئی قسم کے تصفیے کئے اور ہمارے لئے ان میں سے کسی تصفیے کو برقرار رکھنا ناممکن اور نامناسب ہے۔ یہ نقشے اور معاہدے برطانوی سامراج نے تیار کئے تھے، ان معاہدوں اور نقشوں سے یہ مطلب نکالنا کہ ہم بھی وہی کارروائی کریں جو اُنہوں نے کی تھی، نامناسب ہے۔"

ان تمام حقائق سے واقف ہونے کے باوجود ایوب خان نے بھارت کو مشترکہ دفاع کی پیشکش محض اِس لئے کی تھی کہ امریکہ کی خوشنودی حاصل ہو جائے۔ لیکن پنڈت نہرو نے اِس پیشکش کو پائے حقارت سے ٹھکرا دیا۔

سرحدی معاہدہ

جب امریکی سامراج نے ایوب حکومت کے احتجاج کے باوجود بھارت کی فوجی امداد برقرار رکھی۔ تو ایوب خان

چین بین الاقوامی امور میں بڑی طاقتوں کی اجارہ داری کے خلاف ہے

پاک چین دوستی کے مخالف سامراجی ملکوں کے خلاف لب کیوں نہیں کھولتے؟

نے چین کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا۔ چین نے بھی فراخدلی کا ثبوت دیا۔ مارچ ۱۹۶۱ء میں حکومت پاکستان نے سنکیانگ اور بلتستان کی سرحد متعین کرنے کی تجویز پیش کی۔ جسے چین نے فوراً تسلیم کر لیا۔ چار ماہ کی گفت و شنید کے بعد دونوں ممالک کے درمیان ایک سرحدی معاہدہ ہوا جسکے تحت پاکستان کو ۷۵۰ مربع میل کا علاقہ مل گیا۔ جس میں شمشال کی چراگاہیں بھی شامل تھیں۔ سرحد کا خط عین کے ٹو پہاڑ کے اوپر کھینچا گیا اور پہاڑ کی چوٹی دونوں کی ملکیت قرار پائی۔ جیسا کہ ماؤنٹ ایورسٹ کی چوٹی دو ملکوں کی ملکیت ہے۔

ہوائی مواصلات کا معاہدہ

اگست ۱۹۶۳ء میں پاکستان اور چین کے درمیان ایک ہوائی مواصلات کے معاہدے پر دستخط ہوئے جس کے تحت ۲۹ اپریل ۱۹۶۴ء کو دونوں ملکوں کے درمیان براہِ راست ہوائی سروس شروع ہو گئی۔

پاک بھارت جنگوں میں چین کی امداد

ستمبر ۱۹۶۵ء میں جب بھارت نے پاکستان پر حملہ کیا، تو سیٹو اور سنٹو کے رُکن ممالک اور پاکستان کے فوجی اتحادی امریکہ نے اپنے اوپر گہری خاموشی کا لبادہ اوڑھ لیا۔ اُن میں سے بعض نے کھُل کر بھارتی حکومت کی حمایت کی جب کہ چین نے فوجی اتحادی نہ ہونے کے باوجود ہر طرح سے پاکستان کی حمایت کی اور امداد دی۔ امریکی سی آئی اے نے بھارتی حکومت کو مشرقی پاکستان پر حملہ کرنے کا مشورہ دیا۔ اس مقصد کے لیے سی آئی اے کا ایک ایجنٹ کلکتہ بھیجا گیا تاکہ وہ مشرقی پاکستان پر حملہ کرنے کے لیے بھارتی حکمرانوں اور حکام کو راضی کرے۔ یہ انکشاف نومبر ۱۹۶۵ء میں بھارتی ہفت روزہ "لنک" نے "سی آئی اے کی حکمتِ عملی" کے عنوان کے تحت ایک مضمون میں کیا ہے وہ لکھتا ہے :

"سی آئی اے نے بھارتی حکومت کو مشرقی پاکستان پر حملہ کرنے کا مشورہ دیا تھا، اس مقصد کے لیے بھارت میں رائے عامہ ہموار کرنے کی کوشش بھی کی گئی تھی۔ سی آئی اے کا ایک افسر کلکتہ آیا اور اُس نے پروپیگنڈہ شروع کیا کہ بھارت کو، مشرقی پاکستان پر حملہ کر دینا چاہیے، اُس نے دُوسرا محاذ کھولنے کے فوجی فوائد کی بھی اچھی طرح وضاحت کی۔ کلکتہ میں وارد ہوتے ہی وہ اچانک بہت مصروف میزبان بن گیا۔ اُس نے ڈنر اور شراب کی کئی دعوتیں دیں۔ جن میں اخبارات کے مالکان، حکام اور دوسری اہم شخصیتوں کی انتہائی خاطر مدارات کی جاتی۔ ان دعوتوں کو مشرقی پاکستان پر بھارتی حملے کے لیے راہ ہموار کرنے کے سلسلے میں استعمال کیا گیا اور مشورہ دیا گیا کہ مشرقی پاکستان پر فوراً حملہ کر دینا چاہیئے۔"

بھارت خود بھی مشرقی پاکستان پر حملہ کر دینا چاہتا تھا لیکن اس سے پہلے کہ وہ اپنے مکروہ منصوبوں کو عملی رُوپ دیتا۔ ۸ ستمبر ۱۹۶۵ء کو چین نے بھارت پر چینی سرحدوں پر جارحانہ کارروائیاں کرنے کا الزام لگاتے ہوئے اُسے اپنی فوجیں ہٹانے کے لیے کہا اور دھمکی دی کہ اگر ایسا نہ کیا گیا تو بھارت کو سنگین نتائج بھگتنا ہوں گے۔ اور اسی کے ساتھ چین نے اپنی سرحدوں پر فوجیں جمع کر دیں۔ چین کی اس دھمکی کی وجہ سے بھارت کو اپنی افواج کی ایک بھاری تعداد "کم" کی سرحد پر لگانی پڑی اور مشرقی پاکستان پر حملہ کرنے کا منصوبہ ترک کرنا پڑا۔

۱۹۷۱ء کی جنگ میں بھی چین نے ہر سطح پر پاکستان کی بھرپور حمایت کی سقوطِ ڈھاکہ کے بعد جنگی قیدیوں کی واپسی کا مسئلہ پیدا ہوا۔ بھارت اور سوویت یونین جنگی قیدیوں کی واپسی کے لیے بنگلہ دیش کو اقوام متحدہ کا رُکن بنانا چاہتے تھے، جب کہ پاکستان کا موقف یہ تھا کہ جنگی قیدیوں کی واپسی سے پہلے بنگلہ دیش کو اقوام متحدہ کی رکنیت نہ دی جائے۔ چین نے پاکستان کے موقف کی حمایت کی اور اسی کی کوششوں سے اقوام متحدہ نے ایک قرارداد پاس کی جس میں اقوامِ متحدہ میں بنگلہ دیش کے داخلے اور جنگی قیدیوں کی واپسی کو لازم و ملزوم قرار دیا گیا۔

پاکستان کے رجعت پسند اور اسلام پسند عناصر چین سے دوستی اور تعلقات بڑھانے کے مخالف ہیں انہیں کمیونزم میں ہوا نظر آتا ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ چین سے تعلقات بڑھانے سے پاکستان میں "اسلام خطرے میں" پڑ جائے گا۔ حالانکہ یہ دلیل بالکل غلط ہے۔ ریاستوں کا واسطہ ریاستوں کے ساتھ بنفسہ ہوتا ہے اُن کے معاشرتی نظاموں یا نظریات کے ساتھ نہیں ہوتا۔ اگر یہ دلیل تسلیم کر لی جائے تو پھر پاکستان کے تعلقات صِرف اسلامی ممالک سے ہونے چاہئیں اور چین کے تعلقات صرف سوشلسٹ ملکوں سے۔ حیرت کی بات ہے کہ یہ اسلام پسند عیسائی دنیا اور سامراجی ممالک کے خلاف لب نہیں کھولتے۔ حالانکہ مسلمانوں کو سب سے زیادہ نقصان سامراجیوں کے ہاتھوں اُٹھانا پڑا ہے۔ سامراجیوں نے ہی مسلمانوں کو غلام بنایا اور صدیوں تک ان کا استحصال کیا اور اب بھی کر رہے ہیں۔ پروفیسر آرنلڈ ٹائنبی نے کہا ہے:

"کمیونزم کے متعلق کچھ سُننے جانے سے صدیوں پیشتر ہمارے آبا و اجداد کو اپنے لیے اسلام میں ہوا نظر آتا تھا۔ سولہویں صدی کے زمانے تک اسلام اہلِ مغرب کے دلوں میں وہی اضطرابی کیفیت پیدا کر دیتا تھا جو بیسویں صدی میں کمیونزم پیدا کرتا ہے اور یہ اضطراب لازمی طور پر ویسی ہی وجوہ کی بنا پر ہے کمیونزم کی طرح اسلام بھی ایک مغرب شکن تحریک تھا۔ اور کمیونزم کی طرح وہ بھی جذبے کی ایک ایسی شمشیر تھی جس کے خلاف مادّی اسلحہ کسی طرح کا دفاع مہیا نہ کرتا تھا۔"

مسٹر بھٹو چین کی اہمیت کو سمجھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اُنہوں نے اقتدار سنبھالتے ہی سب سے پہلے عوامی جمہوریہ چین کا دورہ کیا۔ اب چینی فوجی وفد کا حالیہ دورہ اس بات کی علامت ہے کہ چین ماضی کے مقابلے میں اب پاکستان کو زیادہ معاشی اور فوجی امداد دینے پر رضا مند ہو گیا ہے۔ پاکستان میں چین کی سرمایہ کاری سے جہاں پاک چین دوستی اور مضبوط ہوگی وہاں امریکی اجارہ داری پر ایک ضرب کاری بھی لگے گی اور پاکستان کی خارجہ پالیسی اور زیادہ متوازن اور غیر جانبدار ہو جائے گی۔

سی آئی اے نے
مشرقی پاکستان
پر حملہ کروانے
کے لئے اپنا ایجنٹ
کلکتہ بھیجا



مشرقِ وسطیٰ
بڑی طاقتیں
اور
مغربی یورپ

ایک اخباری جائزہ

مشرقِ وسطیٰ میں امریکہ اور روس کی کشمکش نے مغربی یورپ کو متحد کردیا

ترجمہ • انور عاقل

مشرق وسطیٰ کی حالیہ شدید جنگ میں دو بڑی طاقتوں ۔ امریکہ اور روس کی مغربی یورپ سے لاتعلقی پر مغربی یورپ کے ممالک نے شدید ناراضگی کا اظہار کیا ہے' اُن کی آواز پہلے سے بلند ہے تاکہ یورپی برادری کے سیاسی اتحاد کو مضبوط کیا جاسکے اور مغربی یورپ کے دفاع کو اتنا بڑھا جائے کہ مستقبل میں بڑی طاقتوں کی سیاست میں بڑا بول بول سکے۔

فرانسیسی صدر جارج پامپیڈو' برطانوی وزیرِ اعظم ایڈورڈ ہیتھ اور مغربی جرمنی کے چانسلر ولی برانٹ نے پچھلے دنوں یورپی اقتصادی برادری (ای، ای، سی) کو متحد کرنے کے لئے فوری قدم اٹھایا ہے۔ صدر پومپیڈو نے تجویز پیش کی کہ ای، ای، سی کے نو ممالک کے سربراہ آپس میں ملتے رہیں اور ایسی میٹنگ سال کے خاتمے سے پہلے بلائی جائے۔ ان کی تجویز کو یورپی برادری کے تمام ممالک نے سراہا اور کوپن ہیگن میں دسمبر کے وسط میں ایک میٹنگ بلانے کا فیصلہ ہوا۔

نتائج

مغربی یورپ کے ممالک اب مشرق وسطیٰ کی صورت حال سے نتائج اخذ کر رہے ہیں' حالانکہ جون میں بات چیت کے بعد امریکہ اور روس کے درمیان نام نہاد صلح ہوگئی تھی لیکن مغربی یورپ کے ممالک اس سے قبل ہی اندیشوں میں گرفتار تھے کہ ان دو بڑی طاقتوں کی دو ذہنی مفاہمت مغربی یورپ کے مفادات کو خطرے میں ڈال دے گی۔ اکتوبر کی مشرق وسطیٰ کی جنگ کے بعد یہ اندیشے تشویش میں بدل گئے جب دونوں بڑی طاقتوں نے اس علاقے میں شدید

> حالیہ عرب اسرائیل
> جنگ میں امریکہ نے
> ناٹو کے رکن ممالک
> سے مشورہ نہیں کیا

جنگ کے موقع پر اور مشرق وسطیٰ کے معاملات پر اجارہ داری قائم رکھتے ہوئے مغربی یورپ کے ممالک کو نظر انداز کر دیا۔

کئی مغربی یورپ کے بورژوا اخبارات نے روس اور امریکہ کی نام نہاد صلح و صفائی کے مطالب کو بیان کیا ہے۔

برطانوی اخبار گارجین ۹ نومبر کو لکھتا ہے "صلح بلاشبہ ایک وزنی لفظ ہے اور بڑی طاقتوں کے درمیان جنگ کا محض ایک اور ہتھیار ہے"۔ فرانسیسی اخبار لی فگارو کی ۱۰ نومبر کی اشاعت میں ایک مضمون شائع ہوا جس میں جنرل بیفر لکھتا ہے "صلح" کے مغالطے کی آڑ نے امریکہ اور روس کے مقابلے کو چھپا دیا ہے۔ جہاں ان کے مفادات جدا ہوتے ہیں مضمون میں مزید کہا گیا ہے "اس حقیقت کے باوجود کہ امریکہ اور روس کے تعلقات جدا ہیں چنانچہ" صلح کے باوجود مزید مقابلے حقیقت ہیں۔ یورپ "در اصل 'صلح' کی حدود میں نہیں آتا"۔ مغربی جرمنی کا اخبار DENTSCHE ZEITUNG لکھتا ہے کہ "حالیہ مشرق قریب کے تنازعہ نے یہ دکھا دیا ہے کہ ناگہانی ضروریات کے موقع پر مغربی یورپ ناگزیر طور پر بڑی طاقتوں کے سمجھوتے کا شکار بن جائے گا"۔

مغربی یورپ کے ممالک مشرقِ وسطیٰ کے معاملات سے دو بڑی طاقتوں کے ذریعے نکالے جانے پر سخت برافروختہ ہیں۔ FRANCE SOIR ۳۱ اکتوبر کو اس تصادم پر لکھتا ہے، "واشنگٹن اور ماسکو نے کسی وقت بھی صحیح اطلاعات نہ دیں اور نہ ہی اپنے یورپی ساتھیوں سے مشورہ کیا بلکہ یہ تاثر دینے کی کوشش کی کہ کسی بھی یورپی مداخلت کو ختم کیا جاسکتا ہے"۔

اٹلی کے اخبار LA STAMPA نے ۲۸ اکتوبر کے اداریے میں لکھا کہ "مشرقِ وسطیٰ یورپی معیشت کے لئے اہم ترین ضرورت کا علاقہ ہے۔" حالانکہ یورپی ممالک "اپنے اہم معاملات پر اثر ڈالنے میں ناکام رہے ہیں"۔ گارجین نے ۳ نومبر کے اداریے میں کہا کہ مشرقِ وسطیٰ میں امریکی پالیسی "خطرے کی گھنٹی بجا رہی ہے" جب کہ

باقی صفحہ ۳۰ پر



جماعت اسلامی دو حصوں میں تقسیم ہو گئی

پنجاب میں گیلانی کی قیادت میں مضبوط گروپ قائم ہو گیا

آئی ساکو کے لاکھوں روپے سیکرٹری جنرل رحمت الٰہی کی جیب میں چلے گئے

جماعتِ اسلامی

کراچی کے سابق امیر صادق حسین لکھ پتی کیسے بنے ؟

• الفتح رپورٹ •

جماعت اسلامی ان دنوں اندرونی طور پر شدید انتشار کا شکار ہے۔ اس کا تنظیمی ڈھانچہ جس کے بارے میں عام طور پر خیال تھا کہ بہت مؤثر اور مضبوط ہے۔ چوٹی کے رہنماؤں کے باہمی مفادات کے ٹکراؤ سے ٹوٹ پھوٹ کر بکھرنے والا ہے۔ صوبہ پنجاب کے امیر علیحدہ ہو چکے ہیں یا انہیں الگ کر دیا گیا۔ مجلسِ شوریٰ کے ارکان کے درمیان تنظیمی وسائل کے ذریعہ زیادہ سے زیادہ فائدہ اُٹھانے کی لمبی دوڑ میں رقابتیں بڑھ گئی ہیں۔ ایک دوسرے پر الزام تراشیاں شروع ہو چکی ہیں، "پاکباز" لوگوں کی بدعنوانیاں اور دھاندلیاں الم نشرح ہو رہی ہیں۔ بیچارے سیدھے سادے مسلمان جو اسلام کے مقدس نام کی وجہ سے جماعت اسلامی کے سیاسی فریب میں آ گئے تھے۔ اب ان پر اصل حقائق کا انکشاف ہو رہا ہے تو وہ ورطۂ حیرت میں ڈوب گئے ہیں۔ کیا کسی دوسری سیاسی جماعت نے اپنے مخصوص اغراض اور تنظیمی فائدہ کے لئے اسلام کے نام کو اس بیدردی سے استعمال کیا ہو گا ؟

جماعت اسلامی لوگوں کی ہمدردیاں خریدنے کے لئے بظاہر چند فلاحی کام بھی انجام دیتی ہے۔ جس میں مفت اور سستے شفاخانوں کا نام سرفہرست ہے۔ لیکن بہت کم لوگوں کو یہ بات معلوم ہو گی کہ عوام کی امداد اور چندے سے چلنے والے نام نہاد شفاخانوں سے خود جماعت اسلامی کے چوٹی کے رہنما کتنا مالی فائدہ اُٹھاتے ہیں۔ اسی کو کہتے ہیں آم کے آم اور گٹھلیوں کے دام۔

عیدالاضحیٰ کے موقع پر جماعت اسلامی بڑے پیمانے پر قربانی کی کھالیں جمع کرنے کا کاروبار کرتی ہے۔ تنخواہ دار کارکن محلہ محلہ گھوم گھوم کر کھالیں جمع کرتے ہیں۔ اس طرح ہر سال جماعت کو ہر شہر سے لاکھوں روپے کی کھالیں ملتی ہیں، جن کی آمدنی سے جماعت اپنا سیاسی مقصد پورا کرتی ہے۔ جماعت اسلامی کا کہنا ہے کہ ان کھالوں سے جو آمدنی ہوتی ہے اس سے شفاخانوں کو دیسی ادویات مہیا کی جاتی ہیں۔ عام لوگ جو اصل حقائق سے لاعلم ہوتے ہیں۔ وہ جماعت کی اس دلیل کو مذہب سے وابستگی کی بنا پر قبول کر لیتے ہیں۔ لیکن انہیں یہ بات نہیں معلوم ہے کہ کھالوں اور شفاخانوں کی آڑ میں جماعت کے ممتاز رہنما کیا کاروبار کرتے ہیں۔ اب اصل واقعہ سنیئے۔

جماعت اسلامی کے شفاخانوں کو دیسی ادویات مہیا کرنے کا ٹھیکہ سابق امیر کراچی اور رکن مجلس شوریٰ صادق حسین کو دیا گیا ہے۔ یہ موصوف پروفیسر غفور احمد کے عزیز بھی ہوتے ہیں۔ قربانی کی کھالوں کی آمدنی میں سے انہیں ہر سال یکمشت لاکھوں روپیہ ایڈوانس دے دیا جاتا ہے۔ جس سے وہ دیسی ادویات تیار کرا کر جماعت کے شفاخانوں کو سپلائی کر دیتے ہیں۔ معلوم ہوا ہے۔ کہ وہ دو تین سال میں نصف سے زیادہ رقم بطور منافع حاصل کر کے لکھ پتی بن گئے۔

اس سے قبل جماعت اسلامی کے سیکرٹری جنرل رحمت الٰہی، حکیم اقبال حسین اور سلطان احمد "آئی ساکو" کے نام سے ایک دواخانہ چلاتے تھے۔ اس دواخانہ کے ذریعہ تینوں افراد لاکھوں روپے کے مالک بن گئے۔ بعد میں اقبال حسین اور رحمت الٰہی اس منافع بخش کاروبار سے علیحدہ ہو گئے اور دواخانہ سلطان احمد کے پاس رہ گیا، جنہوں نے جماعت اسلامی کو خیرباد کہہ دیا ہے۔ حکیم اقبال حسین اور رحمت الٰہی نے سابق امیر کراچی صادق حسین کو مزید فائدہ پہنچانے کے لئے مطب خدمتِ خلق سے مزید دس ہزار روپے دلوا دیئے۔ اس طرح صادق حسین کو دو تین سال کے اندر اندر جماعت کے وسائل کے ذریعے لکھ پتی بنا دیا گیا۔

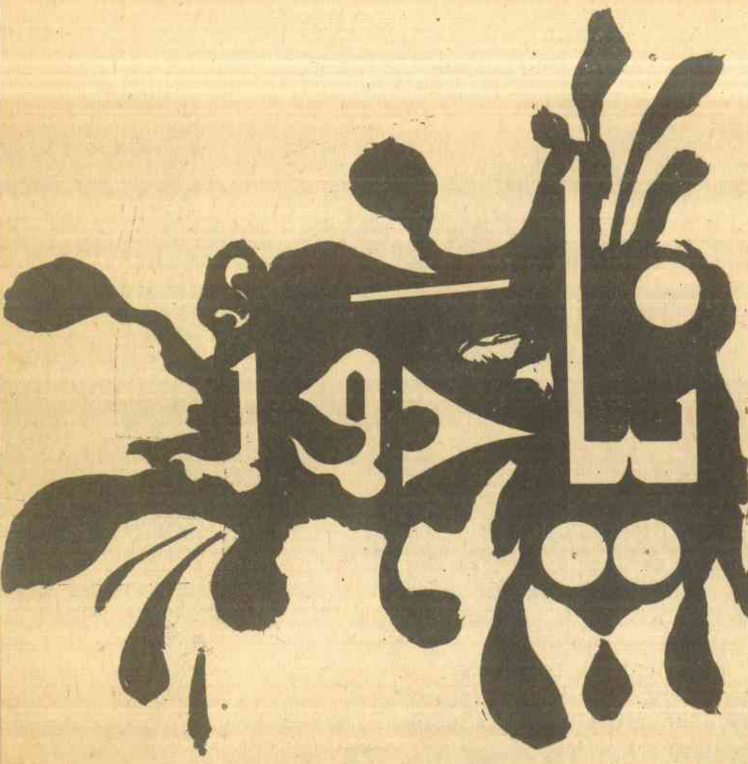
جماعت اسلامی کے اندر تنظیمی وسائل سے فائدہ اُٹھانے کی کوشش میں جب دھاندلیاں اور بدعنوانیاں ناقابلِ برداشت ہو گئیں تو پنجاب کے امیر گیلانی نے اعتراض کیا اور بدعنوان عناصر پر کڑی تنقید شروع کر دی۔ اس طرح تنظیمی ڈھانچہ کے اندر گیلانی کی قیادت میں ایک ایسا گروپ پیدا ہو گیا۔ جو بدعنوان عناصر کا محاسبہ چاہتا تھا۔ اس گروپ کا پہلا مطالبہ یہ تھا کہ ادویات کی سپلائی کے لئے ٹینڈر نہیں مانگے جاتے۔ بلکہ اندر ہی اندر لاکھوں روپے ہضم کر لئے جاتے ہیں۔ تنظیمی سطح پر اس قسم کی بدعنوانیوں کی تحقیقات کی جائے اور عام کارکنوں کو اصل حقائق سے آگاہ کیا جائے تاکہ جماعت میں بدعنوانی کی راہ جڑ نہ پکڑنے پائے۔

امیر صوبہ پنجاب گیلانی اور ان کے ہمنواؤں کے اس مطالبے نے جماعت اسلامی کے تنظیمی ڈھانچہ کو ہلا کر رکھ دیا۔ کارکنوں پر پہلی بار راز کھلا کہ ہائی کمان کے رہنما کس طرح سالہا سال سے جماعت کے وسائل

سے ذاتی فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ ان میں غم و غصہ کی لہر دوڑ گئی۔ انہوں نے ہر تنظیمی نشست میں اس مسئلہ کو چھیڑ کر بھرپور انداز میں تنقید کا سلسلہ شروع کر دیا جسکا نتیجہ یہ نکلا کہ پنجاب میں کارکنوں کی بڑی تعداد ہائی کمان سے برگشتہ ہو کر گیلانی گروپ میں شامل ہو گئی۔ اس صورتحال سے جماعت اسلامی کی ہائی کمان بوکھلا گئی۔ حالات سے نمٹنے کے لئے رحمت الٰہی، صادق حسین اور غفور احمد رکن قومی اسمبلی نے سازش تیار کی، اور گیلانی پر الزامات لگا کر جماعت سے علیحدہ کر دیا گیا۔

جماعت سے گیلانی کی علیحدگی کے بعد بدعنوان عناصر کو لوٹ مار کا ایک بار پھر موقع مل گیا۔ اگر گیلانی کو فوری طور پر جماعت سے علیحدہ نہ کیا جاتا تو ایک طرف بدعنوانیوں کا راستہ بند ہو جاتا، تو دوسری جانب سیکرٹری جنرل رحمت الٰہی دھاندلیوں کا بھی پردہ چاک ہو جاتا۔

جماعت اسلامی کی نام نہاد "نیک نامی" اب کھل کر بدنامی میں تبدیل ہو رہی ہے۔ اندرونی سازشیں روز بروز تیز ہوتی جا رہی ہیں۔ عام کارکنوں میں اعلیٰ رہنماؤں کے خلاف نفرت بڑھتی جا رہی ہے۔ اور وہ دن دور نہیں کہ جماعت اسلامی کا شیرازہ تیز ہوا کے جھونکے سے منتشر ہو جائے گا۔



عصمت اللہ خاکی

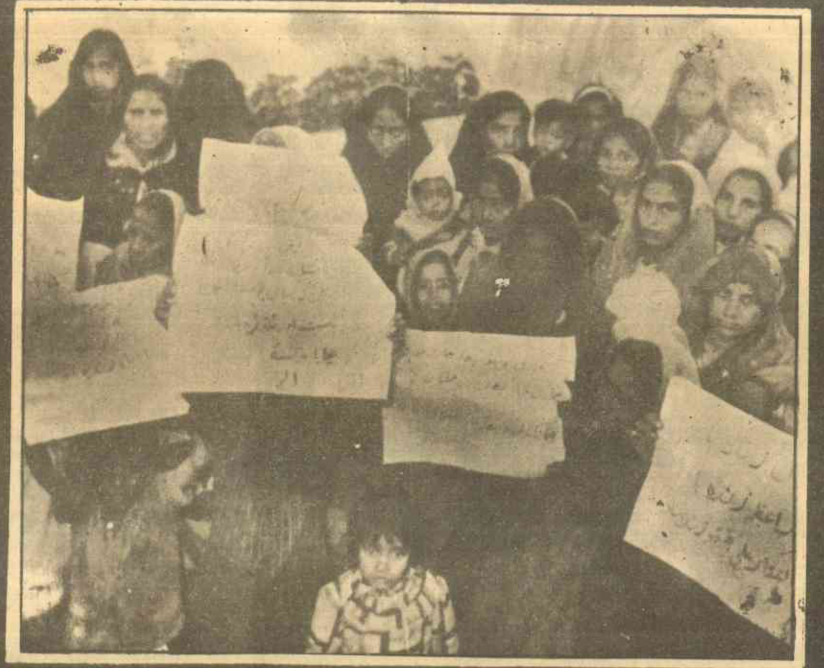
ہر نیا دور جب آتا ہے تو یوں لگتا ہے
جیسے اب کے مری بگڑی ہوئی تقدیر سنور جائے گی

میری دیرینہ فلاکت کے بھیانک سائے
اور یہ فاقہ کشی جو مجھے ورثہ میں ملی
میرے اسلاف کی بخشی ہوئی سوغاتِ کہن
جس کو چمٹائے ہوئے اپنے کلیجے سے مجھے سینکڑوں سال یونہی بیت گئے

کتنی صدیاں مری نسلوں پہ کچھ ایسے گذریں
دانے دانے کو ترستے رہے فرزند مرے
اپنی غیرت کا جنازہ لئے در در وہ پھرے
ایک روٹی کے لئے
برہنہ جسم چھپانے کے لئے
روح اور جسم کے رشتوں کے تحفظ کے لئے
جب کبھی میں نے شکایت کے لئے لب کھولے
اور چاہا کہ مری بات سنی جائے سیاست کے نہاں خانوں میں
زیرِ لب جب کبھی میں نے یہ کہا
"یہ مرا دور نہیں"
مجھ کو اس دور کے ثمرات سے کچھ بھی نہ ملا
اس نئے دور میں بھی میرے مقدر کا اندھیرا نہ گیا
آج بھی روح اور جسم کے رشتوں کے تحفظ کے لئے
آج بھی غربت و افلاس کے چنگل سے نکلنے کے لئے
بک رہی ہے بھرے بازار میں سستے داموں
میری محنت مرا اعزاز و وقار
اہلِ زر اہلِ ہوس آج بھی میرے لہو کے پیاسے
اب بھی تکتے ہیں مرے گھر کی طرف یوں۔ جیسے
میرے ناموس پہ ہو ان کی اجارہ داری"
زیرِ لب جب بھی کبھی میں نے کہا یہ سب کچھ
ہر نئے دور کے خود ساختہ آقاؤں نے
امن و تہذیب کے نگرانوں نے
میری خاموش شکایت کو بغاوت کہہ کر
مجھ پہ کیا کیا نہ ستم ڈھائے ہیں
مجھ کو راہوں میں زد و کوب کیا
بھر دیئے مجھ سے نئے دور کے زنداں خانے
گولیاں مجھ پہ چلیں اور مرا خون ناحق
جگمگاتی ہوئی سڑکوں پہ فراوانی سے
ہر نئے دور میں بہتا ہی رہا
اور تب مجھ پہ کھلا
"ہر نئے دور کی بنیاد مرے خون سے ہے"
میں کہ اس کرۂ خاکی پہ خدا کا نائب!
آدمیت کا شرف،
ہے مرا نام عوام

اورنگی ٹاؤن

پر غنڈوں نے اپنی حکومت قائم کرلی



اورنگی کا دوسرا بڑا مسئلہ، بیروزگاری

سندھ کے نئے وزیرِ اعلےٰ جناب غلام مصطفےٰ جتوئی نے عہدہ سنبھالنے کے فوراً بعد پیپلز پارٹی کی سیکرٹریٹ میں کھلی کچہری منعقد کی، اور لوگوں کی شکایتیں سنیں۔ اس دوران بجھے چہروں اور اداس آنکھوں والی بے شمار عورتوں، مردوں، بوڑھوں اور بچوں کا ایک جمِ غفیر باہر اکٹھا ہوگیا۔ ان کے ہاتھوں میں گتے اور موٹے کاغذوں کے پلے کارڈ تھے۔ جن پر "عوامی حکومت زندہ باد، وزیرِ اعظم بھٹو زندہ باد، ہمیں مفاد پرست اور غنڈہ عناصر سے بچایا جائے، ہماری فریاد ہے ہماری مدد کی جائے" کے الفاظ درج تھے۔

ان میں سے ایک پھٹے ہوئے برقعہ میں ملبوس عورت رئیسہ بیگم نے بتایا "اورنگی ٹاؤن میں غنڈوں نے ہمارا جینا دوبھر کردیا ہے۔ جھگیوں کے ٹوٹے ہوئے دروازے زبردستی کھول کر سامان لے جاتے ہیں، ایک دن کام سے بازار گئی، واپس آئی تو دیکھا گھر کا سامان بکھرا پڑا تھا۔ بچے رو رہے تھے میرے ایک بچے کے سر سے خون بہہ رہا تھا۔ اس نے غنڈوں کو روکنے کی کوشش کی تھی۔ انہوں نے اس کو اتنا مارا کہ اس کا سر زخمی ہوگیا۔ صندوق اٹھا کر لے گئے جس میں گھر کا خرچ پڑا ہوا تھا۔ اب تم ہی بتاؤ ہم کس طرح زندہ رہیں۔ پولیس غنڈوں کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کرتی۔ شاید ڈرتی ہے، اگر ایسا ہے تو ہم کس سے انصاف مانگیں ظالموں کی فریاد کہاں لے کر جائیں؟"

ایک ضعیف العمر نورالدین نے جو حال ہی میں مشرقی پاکستان سے انتہائی کسمپرسی کے عالم میں یہاں پہنچے ہیں بتایا: "میرے ایک رشتہ دار نے پہلے سے یہاں ایک جھگی ڈال رکھی تھی، میں اپنے نواسے اور نواسیوں کے ساتھ اس میں ٹھہر گیا۔ ایک ہفتہ قبل اس علاقہ کا ایک دادا آیا اور اس نے حکم دیا کہ ہم یہ جھگی خالی کردیں۔ یہ کسی اور کو الاٹ کردی گئی ہے۔ اس نے ہمیں ایک ہفتہ کی مہلت دی اور چلتے وقت دھمکی دی کہ اگر ایک ہفتہ کے اندر اندر جھگی خالی نہ کی گئی تو ہمارا سامان اٹھا کر باہر پھینک دیں گے زبردستی گھر خالی کرائیں گے۔"

ہم نے اس ظالم غنڈہ کے خلاف لوگوں سے فریاد کی، پولیس والوں کو بتایا، مگر ہماری دادرسی کے واسطے کوئی آگے نہ بڑھا۔ پڑوسی خوف کے مارے دبک گئے، پولیس نے کوئی کارروائی کرنے سے انکار کردیا۔ ایک ہفتہ کے بعد وہ غنڈہ اپنے دس پندرہ ساتھیوں کو لے کر آیا اور زبردستی ہمارا سامان نکال کر باہر پھینک دیا۔ اس نے ہمارا مذاق اڑاتے ہوئے کہا: "کھلے ہوئے آسمان کے نیچے زندگی بسر کرو، یہ اللہ کی زمین ہے۔ یہاں سے تمہیں کوئی باہر نہیں نکالے گا۔" پتا چلا کہ اس غنڈہ نے پانچسو روپے لے کر ہماری جھگی دوسرے شخص کو فروخت کر دی، بوڑھے نے تاسف بھرے لہجے میں کہا: "یا اللہ پاکستان بنانے اور بچانے کے جرم میں اتنی بڑی سزا۔؟"

ایک ادھیڑ عمر کی عورت فاطمہ بی بی زار و قطار رو رہی تھی۔ وہ بار بار اپنے سینے پر دو ہتھڑ مار کر کہتی "پروردگار زمین پھٹ جائے اور میں اپنی تمام مصیبتوں کے ساتھ اس میں سما جاؤں۔" یہ عورت بھی مشرقی پاکستان سے اپنی ایک نوجوان لڑکی کے ساتھ جان بچا کر آئی ہے۔ مکتی باہنی کے رضاکاروں نے اس کے شوہر اور تین لڑکوں کو ذبح کردیا۔ پتہ نہیں کیوں انہوں نے ان پر رحم کھا کر چھوڑ دیا۔ وہ مکتی باہنی والوں کو بُری طرح کوس رہی تھی کہ انہوں نے ماں بیٹی کو اس ظالم دنیا میں اکیلا کیوں چھوڑ دیا۔ اگر انہیں بھی ساتھ ساتھ قتل کر دیتے تو وہ آج تنہا اپنے دکھوں کا ماتم کرنے کے لئے نہیں رہ جاتی۔ اس نے بھراتی ہوئی آواز سے بتایا: "غنڈوں نے ایک ماہ قبل اس کی جوان بیٹی کو اغوا کرلیا۔ اس کی بیٹی کا پتہ نہیں چل رہا ہے۔ زمین کھا گئی یا آسمان نگل گیا۔ اس نے ہر جگہ اس کی فریاد کی" اس کی پیاری بیٹی جو دن رات بیٹھی ہوئی اپنے مقتول باپ اور بھائیوں کے غم میں آنسو بہاتی تھی کہاں گم ہوگئی۔ غنڈوں نے اسے کہاں پہنچا دیا۔" وہ وزیرِ اعلےٰ سندھ کے پاس اپنی فریاد لے کر آئی تھی۔ اپنی گمشدہ یا مغویہ بیٹی کا پتہ پوچھنے آئی تھی۔

مظلوم عورتوں، مردوں اور بچوں پر مشتمل چھوٹا سا قافلہ اورنگی ٹاؤن سے آیا تھا۔ اس قافلہ کی ہر عورت اور بچہ مظلومیت کی چلتی پھرتی تصویر تھا۔ ان کے چہرے کی جھریوں اور آنکھوں کی اداسی سے بھوک، افلاس، مجبوری، بے روزگاری اور غنڈہ گردی کی کربناک داستانیں جھلک رہی تھیں۔ ان کی بنیادی شکایت یہ تھی کہ سب سے پہلے انہیں غنڈہ عناصر سے بچایا جائے جو ان کی

فضل الٰہی

مجبوریوں سے فائدہ اٹھا کر ان کے جان و مال، عزت و آبرو سے کھیل رہے ہیں۔

اورنگی ٹاؤن میں حقیقتِ حال معلوم کیا تو پتہ چلا اس علاقہ میں بعض غنڈہ عناصر نے غنڈہ گردی کو اپنا وطیرہ بنا لیا ہے۔ وہ بے دھڑک مکانات اور جھگیوں میں گھس جاتے ہیں، سامان اٹھا کر لے جاتے ہیں۔ ماہانہ بھتہ وصول کرتے ہیں۔ غریب آبادی سے روزانہ غنڈہ ٹیکس لیتے ہیں۔ اور جو انکار کرتا ہے اس کی پٹائی کی جاتی ہے۔ اگر وہ پولیس کے پاس فریاد لے کر جاتا ہے تو وہاں اسے خاطر میں نہیں لایا جاتا۔ الٹا اسے تھانہ میں بٹھا کر پریشان کیا جاتا ہے کہ وہ بے چارہ آئندہ سے تھانہ نہ جانے کی قسم کھاتا ہے۔

اورنگی ٹاؤن کے باشندوں میں یہ شکایت عام ہے کہ یہاں جنگل کا قانون نافذ ہے، پولیس غنڈوں کی سرپرستی کرتی ہے، کچھ غنڈے اور دادا ٹائپ کے لوگ پیپلز پارٹی کے نام کو بھی استعمال کر رہے ہیں، اپنے تعلقات کا دائرہ صوبائی وزراء تک بڑھا کر دھونس اور دھمکی سے کام نکالتے ہیں۔ غنڈہ گردی کا چلن عام ہے، جدھر دیکھو مسٹنڈے غنڈے سینہ چوڑا کئے ہوئے گھوم رہے ہیں۔ جس کو چاہا، جہاں چاہا پکڑ لیا، اور "ٹیکس" وصول کرلیا۔ راہ چلتی عورتوں سے چھیڑ خانیاں کی جاتی ہیں، اگر کوئی عورت احتجاج کرتی ہے تو اسے اغوا کرنے کی دھمکی دیتے ہیں، گالیاں دیتے ہیں، بے عزتی کرتے ہیں۔

لوگوں نے بتایا کہ یہاں غنڈہ عناصر کے مختلف گروپ موجود ہیں۔ مختلف مقامات پر ان کے اڈے بنے ہوتے ہیں جہاں لوٹ مار اور مظلوموں کو ستانے کے لئے منصوبہ بندی کی جاتی ہے۔ اس کے بعد اسے عملی جامہ پہنایا جاتا ہے، پولیس ان کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کرتی۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ حصہ دار ہے۔ اگر پولیس ان کی سرکوبی کرنا چاہتی، عوام کی رپورٹوں پر کوئی قدم اٹھانا چاہتی تو غنڈہ عناصر کا حوصلہ کبھی اتنا بلند نہ ہوتا۔ جو لوگ ان غنڈوں کی شکایت لے کر جاتے ہیں الٹا انہیں پھانس لیا جاتا ہے۔ لوگوں میں یہ تاثر عام ہے کہ پولیس کے بعض افراد ان کی پشت پناہی کرتے ہیں، اس وجہ سے لوگوں کا خوف دو بالا ہوگیا ہے۔ یہ غنڈے چرس اور افیون کا ناجائز کاروبار بھی کرتے ہیں۔ ممکن ہے اس غیر قانونی کاروبار سے ہونے والی آمدنی میں پولیس کے

اُس کی جواں سال بیٹی کو اغوا کرلیا گیا

کچھ لوگ شراکت دار بھی ہوں۔ اور شاید یہی بنیادی وجہ ہے کہ ان بدمعاشوں اور شہدوں کے خلاف کوئی قانونی قدم نہیں اٹھایا جاتا ہے، اگر صورتِ حال کچھ ایسی ہی ہے تو ہماری انتظامیہ کے لئے یہ بات لمحہ فکریہ ہے کہ پولیس اور قانون سے لوگوں کا اعتماد اٹھ جائے۔ اورنگی ٹاؤن میں دوسرے بنیادی مسائل بھی توجہ طلب ہیں۔

طبّی امداد کا فقدان

اتنی کثیر آبادی میں جس میں مشرقی پاکستان سے آنے والے مہاجرین کی وجہ سے برابر اضافہ ہو رہا ہے طبّی امداد کا کوئی معقول انتظام نہیں ہے، گندگی اور دوسری وجوہ کے سبب یہاں متعدد قسم کی خطرناک بیماریاں عام ہیں۔ معمولی قسم کی بیماریوں کے علاج کے لئے بھی معقول انتظام نہیں ہے۔ انہیں دو تین روپے خرچ کرکے جناح یا سول ہسپتال میں آنا جانا پڑتا ہے، اگر اس علاقہ میں طبّی امداد کے مواقع میسر آجائیں تو لوگوں کو روزانہ دو

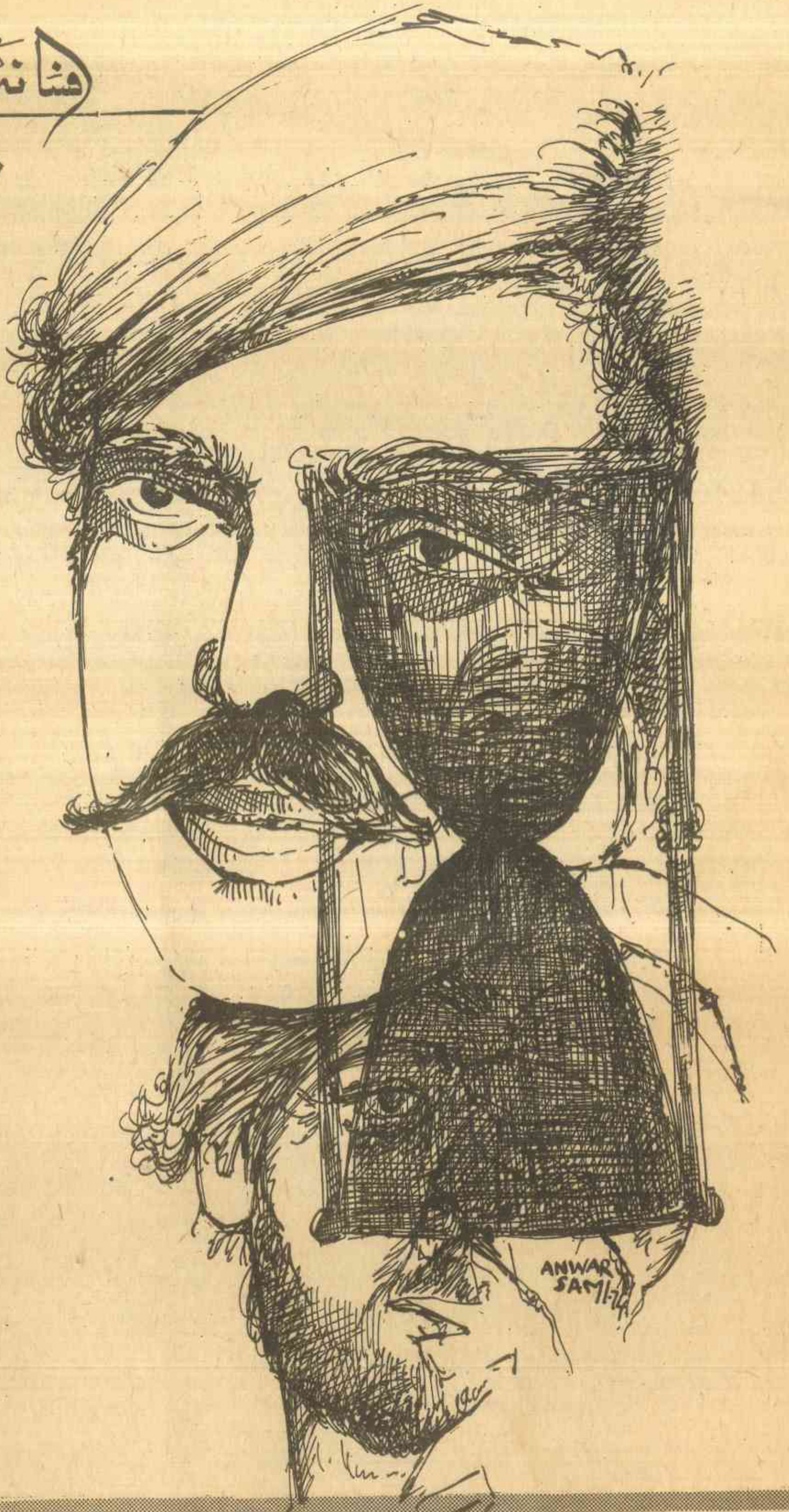
باقی صفحہ ۳۱ پر

غنڈے نے ۵ سو روپے لیکر جھگی دوسرے کے حوالے کردی

"کھلے آسمان کے نیچے زندگی بسر کرو، یہاں سے تمہیں کوئی نہیں نکالے گا"

افسانہ

نعیم آروی



گرتی دیواریں

شام ہوئی، دھند ہوئی، رات ہوئی، تاریکی ہوئی! دیئے کی روشنی میں جب رام نرائن نے بھات کھانا بلکہ نگلنا شروع کیا تو رکمنی کے چہرے پر جیسے دیوالی کی روشنی پھوٹ پڑی۔ وہ بڑی میٹھی میٹھی نظروں سے رام نرائن کو بھات کھاتے دیکھتی رہی۔ کمرے کے طاق پر جلتا ہوا دیا ہلکی ہلکی روشنی دیتا رہا۔

اُوسارے کی چارپائی پر لکھن اور بیراج سو رہے تھے۔ بیراج کی عمر یہی کوئی پندرہ سولہ سال کی ہوگی، اور لکھن آٹھ برس کا تھا۔ دونوں صبح ہی صبح رام نرائن کا ہاتھ بٹانے مولا باغ چلے جاتے اور رنگ برنگے اُودے، نیلے، ہرے، کاسنی اور سُرخ پھولوں کو پتیوں سمیت توڑ توڑ کر بابا کے گچھے میں پھینکتے جاتے۔ اور ہولے ہولے تامنگیشکر کے گیت گنگناتے جاتے تھے۔

"کاہے کو منوا میں آگ لگائے رے سنوریا"

رام نرائن ان کے گیت کے بول سُن سُن کر بڑا حیران ہوتا تھا۔ کبھی وہ بھی لکھن اور بیراج ہی کی طرح نوعمر اور ناتجربہ کار تھا۔

پربھات پھیری کے سمے وہ اپنے بابا بدری ناتھ کے ساتھ چارپائی چھوڑ دیتا تھا۔ دونوں ساتھ ساتھ اُٹھتے۔ محلے کے نل کے نیچے وہ ایک چادر لپیٹ کر بیٹھ جاتا۔ بدری نرائن رگڑ رگڑ کر اس کے بدن کی صفائی کرتا۔ اور پیتل کے برتن کی طرح اُس کے جسم کو چمکا دیتا تھا۔ پھر وہ دونوں منہ میں گنگا جل ڈال کر پربھات پھیری کے دوسرے چکر میں شریک ہو جاتے تھے۔ پو پھٹتے پھٹتے وہ مولا باغ پہنچتے۔ اور سورج کی پہلی روپہلی کرن کے ساتھ ہی وہ گھر کے دوارے پر قدم رکھتے۔ پیر دھو کر باپ بیٹا رسوئی گھر میں گھُس کر ناشتہ کرنے لگتے۔

اتنے میں بدری نرائن کی بیوی موتیا، جوہی، اور چنبیلی کے ہار گوندھ لیتی۔ باسی گجرے رات بھر پانی کے چھڑکاؤ سے اگر تازہ نہ رہتے تو مرتے بھی نہ تھے۔ ادھر بدری نرائن موتیا، چنبیلی اور جوہی کے ہار سمیٹ کر اپنی دکان پر پہنچتا تو بجلی چوک صبح کی تازگی اور پیاری پیاری دھوپ میں پیتل کی تھالی کی طرح جگ مگ کرتی رہتی۔

اس تمام عرصے میں رام نرائن رمائن کی چوپائیاں گنگناتا رہتا یا پھر — "بھجو رام، سیتا رام، راجا رام" — کے ورد میں مصروف رہتا — اُس کے منہ سے کبھی کسی بازاری گیت کے بول نہ نکلتے۔ کیونکہ ریڈیو اور بائیسکوپ

تو بہت بعد کی ایجادیں تھیں۔ البتہ اس کی جوانی تک نوٹنکی اور بنارس کے بھانڈوں کا بڑا شور تھا۔ مگر ان دونوں کا تجربہ کرنا تو الگ رہا، ان کے متعلق سوچنا بھی وہ مہا پاپ سمجھتا تھا۔ کیونکہ بدری نرائن کی بے پناہ محبت اور کڑی نگرانی نے اسے اس مسئلے پر کبھی سنجیدگی اور آزادی سے غور کرنے کا موقع ہی نہ دیا۔ اور اگر کبھی اُس نے جان بوجھ کر سوچنے کی کوشش بھی کی تو ذہن آپ ہی آپ ان سے ہٹ کر مولا باغ کے پھولوں کی جھاڑیوں میں الجھ کر ٹھنڈا ہو جاتا تھا۔ وہ جب کچھ سیانا ہوا اور مسیں کچھ کچھ بھیگیں تو ایک روز بدری نرائن نے اُسے اُوسارے میں بٹھا کر کہا:

" ببوا! ناچ، نوٹنکی، تاڑی اور دارو سب اُن کے چونچلے ہیں جن کے پاس دھن ہے۔ اور جن کی ساری زندگی استیہ اور اینائے میں گذرتی ہے۔ ہمارے پاس نہ تو دھن ہے اور نہ ہماری زندگی استیہ اور اینائے کے پیچھے بھاگتی ہے۔ ہم سیدھے سادھے منش ہیں۔ اور ہمیں سیدھی سادی زندگی بسر کرنی چاہیئے ۔۔۔ پھول ہمیشہ شاخوں پر اچھے لگتے ہیں یا پھر شیلو کے چرنوں میں۔ رنڈی کے کوٹھے پر پہنچنے کے بعد ان کی شوبھا ختم ہو جاتی ہے۔ اگر تمہیں اس عمر میں دارو اور نوٹنکی کے چسکے لگ گئے تو جوانی رنڈی کے کوٹھے پر ہی ختم ہو گی۔"

بدری نرائن نے زندگی میں پہلی مرتبہ رام نرائن سے اتنے کھل کر گفتگو کی تھی۔ خود رام نرائن حیران تھا کہ بابا کو کیا ہوا۔ جو آج کھلی کھلی بہکی بہکی باتیں کر رہے ہیں۔ اُنکے منہ سے تو وہ آج تک گنوتی سیتا کی ستیہ اور پاک دامنی کے چرچے سنتا آیا تھا۔۔۔ سو بیلائیں رچانے والے، گوکل کے نٹ کھٹ گوالے کنہیا کی شرارتیں، کانوں کے رستے جسم کے انگ انگ میں امرت گھولتی رہی تھیں۔ سورداس، بھگت کبیر میرا بائی کی بھگتی اور قربانیوں کی رچنائیں پڑھ پڑھ کر اُس نے صرف ایک ہی بات سیکھی تھی۔۔۔

" ستیہ صرف نرائن ہی کے ساتھ ہے۔"

مگر بدری نرائن آج ان تمام باتوں کو چھوڑ کر اسکے ساتھ عجیب عجیب تھکا دینے والی باتیں کر رہا تھا۔

بدری نرائن جب تمام باتیں کہہ چکا تو اپنے لاڈلے کے چہرے کی جانب دیکھ کر دو چار لمبی لمبی ٹھنڈی سانسیں لیتے ہوئے بولا ۔۔۔

" ببوا! کبھی ہم بھی تمہاری عمر کے تھے۔ اس عمر میں خواہ مخواہ کے انجانے، اَن دیکھے روگ لگ جاتے ہیں۔ بڑی ظالم عمر ہوتی ہے۔ اسی لئے آج ایسی باتیں جو مَیں نے [illegible] اکر رکھی تھیں، کہہ سنائیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ تم بھٹک کر اندھے راستے پر لگ جاؤ ۔۔۔ جن کی منزل بجلی چوک کی اندھی سیڑھیاں ہوتی ہیں۔

بدری ناتھ تھا تو مالی۔ گوپالی کنوئیں کے قریب ہی بجلی چوک پر پھولوں کی ایک دُکان تھی۔ بازار کے بیچوں بیچ، برسوں کی دکانداری نے اُسے بڑا تجربہ کار اور سیانا بنا دیا تھا ۔۔۔ رات گذرتی اور جب کوٹھوں پر طبلے کی تھاپ اور پائل کی جھنکار کی ملی جلی آوازوں میں شہر کی مایۂ ناز طوائف سنجوگ کی سُریلی آواز میں گیت کے بول گونجتے تو بڑی دیر تک واہ ۔۔۔ واہ کا شور بپا رہتا۔

" پلٹ رہتی راجا تورے بنگلے سے۔"

وہ سالہا سال سے اس گیت کے بول سُنتا چلا آرہا تھا، اور سالہا سال سے وہ ایک ہی تماشہ دیکھتا چلا آرہا تھا واہ واہ کے شور میں نوٹوں کی بارش ہوتی۔ پھر اس شور میں کسی کی جیب خالی ہو جاتی۔ اور جب اُس کے پاس دینے کو کچھ نہ ہوتا تو بلا وجہ شور مچا کر اپنی پشیمانی چھپانے کی کوشش کرتا ۔۔۔ سنجوگ، حسین اور کافر ادا سنجوگ جو ہر سال پھاگن اور بسنت میں راجواڑوں سے لاکھ دو لاکھ سمیٹ لاتی تھی، زیادہ دیر تک خالی خولی شور برداشت نہ کرتی، اور اس کے ایک ہلکے سے اشارے پر لوگ اُسے اُٹھا کر سیڑھیوں سے نیچے لڑھکا دیتے ۔۔۔ سیڑھیوں کی تاریکی میں الجھتا ہوا نشے میں دُھت وہ قلابازیاں کھا کر سیدھے بدری نرائن کی دکان کے سامنے دھڑام سے گرتا ۔۔۔ اور گھنٹے دو گھنٹے نالی کے قریب پڑا قے کرتا رہتا اور اُٹھ کر جھومتا جھامتا کسی طرف نکل جاتا۔

یہ روز کا تماشہ تھا جسے بدری نرائن بڑی بیگانگی اور اجنبیت سے دیکھتا اور ٹھہر ٹھہر کر پھولوں پر پانی کے چھینٹے مارنے لگتا تھا ۔۔۔ وہ اکثر نالی کے قریب پڑی ہوئی اجنبی صورت میں اپنے جوان بیٹے رام نرائن کی شبیہہ تلاش کرنے لگتا، اور بڑے بیاکل من سے ہرے رام ہرے رام کی جاپ شروع کر دیتا تھا۔

ایک روز کھری کھری چارپائی پر پڑے ہوئے بیٹے کی جوانی کو دیکھا تو گھبرا گیا ۔۔۔ اُس سے رہا نہ گیا۔ رام نرائن جاگا تو اُس کے سامنے نصیحتوں کا پٹارہ کھول کر بیٹھ گیا۔

بیوی نے سمجھایا بھی کہ " جوان بیٹے کے سامنے ایسی ویسی باتیں کر کے بھلا تمہیں لجا نہیں آتی۔" مگر اُس نے اپنی بیوی کو بھی ایک ہلکی سی ہُش کر کے چُپ کرا دیا۔

رام نرائن نے عمر کی پندرھویں منزل میں قدم رکھا تو بدری نرائن نے ایک مناسب رشتہ تلاش کر کے اُسکی شادی کر دی۔

گونا کے دن جب وہ اپنی دلہن کو لے کر گھر میں داخل ہوا تو کچھ دوستوں نے شادی کی خوشی میں نوٹنکی دیکھنے کی دعوت دی، بلکہ اصرار کر کے اُسے ساتھ لے گئے۔

نوٹنکی اس کی زندگی کا پہلا اور ناقابلِ بیان تجربہ تھا۔ اسٹیج کی بھرپور روشنی میں جب ایک کامنی سی چھوکری بار بار اپنی کمر کو دائرے میں گردش دیتی ہوئی جھٹکے پر جھٹکا دیتی تو رام نرائن کے جسم کا جوڑ جوڑ انگڑائی لینے لگتا، اور بدن کا سارا خون کنپٹیوں میں سمٹ کر شوں ۔۔۔ شوں بولنے لگتا تھا۔

نوٹنکی کا شو ختم ہوا تو اُس نے دل ہی دل میں سوچا:

" اچھا ہی ہوا جو مَیں نوٹنکی نہیں دیکھ سکا تھا۔"

اُس دن کے بعد سے اُس نے کبھی نوٹنکی کی طرف رُخ نہ کیا۔ اکثر اس کے دوست کھینچتے۔ مگر وہ اُن سے یہ کہہ کر پیچھا چھڑا لیتا ۔۔۔

" کھیل تماشے جی کو ہلکا کرنے کے لئے ہوتے ہیں۔ مَن اور تن کو روگ لگانے کے لئے نہیں۔ مَیں نے تم لوگوں کے ساتھ زندگی میں ایک بار پاپ کیا تھا۔ اب دوبارہ وہ پاپ مجھ سے نہ ہوگا ۔۔۔"

رام نرائن، بیراج اور لکھن کو پھول توڑتے ہوئے گنگناتے سنتا تو اُس کا ماتھا ٹھنکنے لگتا۔

" کاہے کو منوا میں آگ لگائے رے سنوریا" ۔۔۔

گیت کا بول رام نرائن کے لئے خطرے کی گھنٹی تھا۔ ٹھیک ایسی ہی گھنٹی اس وقت بھی بجی تھی جب بدری نرائن نے رام نرائن کے ننگے اور جوان جسم کو کھری چارپائی پر اوندھے سیدھے پڑا پایا تھا ۔۔۔ رام نرائن کو اپنے بابا کی ساری نصیحتیں ایک دم سے یاد آگئیں۔ اُسنے چارپائی پر لیٹے لیٹے سوچا، یہی وقت ہے جب اندھی اور منہ زور جوانی کو تجربے اور نصیحتوں کی لگام سے روکا جاسکتا ہے۔ اس نے جب اس سلسلہ میں رکمنی سے مشورہ کیا تو وہ گھبرا کر بولی :-

" ہے رام، ایسی باتیں تم اپنے بچوں سے کرو گے۔ تمہیں شرم نہ آئے گی ایسی باتیں کرتے ؟"

مگر رام نرائن نے اپنی بیوی کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

" پگلی تو نہیں جانتی، زمانہ بدل گیا ہے۔ میری باتوں سے ان پر اچھا ہی اثر پڑے گا ۔۔۔ اور پھر وہ یہ بھی جان لیں گے کہ مَیں ایسی ویسی باتیں پسند نہیں کرتا ۔۔۔ بابا نے بھی اسی عمر میں مجھ سے ایسی باتیں کی تھیں، جنھیں سن کر مَیں بوکھلا گیا تھا۔ مگر اب مَیں سوچتا ہوں کہ ان کی باتیں کتنی سچی تھیں ۔۔۔"

مگر رکمنی نے رام نرائن کی باتوں سے اتفاق نہ کیا

اور بولی۔" سال دو سال ٹھہر جاؤ، جب وہ تمہاری باتیں سمجھنے کے قابل ہو جائیں گے، پھر کر لینا۔"

رام نرائن رکمنی کی بات ٹالنا پسند نہ کرتا تھا، کیونکہ رکمنی اس کی دنیا کی واحد محبت، دلچسپی اور رنگینی تھی۔ اٹھارہ، اُنیس سال کی رفاقت نے ان دونوں کو ایک دوسرے سے اس قدر قریب کر دیا تھا کہ وہ دونوں اپنا الگ الگ وجود بھول کر ایک دوسرے میں مدغم ہو چکے تھے۔

رکمنی کے انکار کے سبب بات رام نرائن کے اندر ہی گھٹ کر رہ گئی اور نصیحتوں کا پٹارہ کھلنے سے رہ گیا۔

رام نرائن نے کروٹ بدلتے ہوئے کہا۔" اچھا اگر تم کہتی ہو تو میں بات نہیں کرتا، مگر بنارس کے میلے سے لوٹنے کے بعد ان سے ضرور بات کروں گا۔"

"کر لینا"۔ رکمنی اندھیرے میں ہاتھ پھیلاتے ہوئے نندیا سی آواز میں بولی، اور خاموش ہو گئی۔

بنارس کے میلے میں روانگی سے ایک روز قبل رام نرائن نے اپنے دونوں بیٹوں سے کہا۔" تم دونوں اس گھر کے مالک ہو۔ میرے یہاں نہ ہونے پر کوئی ایسی ویسی بات نہ کر بیٹھنا کہ پورکھوں کی آتما بیاکل ہو جائے۔ اور ہاں رات دیر تک دکان کھلی نہ رکھنا۔ جلدی گھر چلے آیا کرنا۔ سمجھ گئے نا۔" رام نرائن تاکیداً یہ بات بیراج سے کہہ کر رکمنی کے چہرے پر کچھ تلاش کرنے لگا۔

رکمنی جلدی سے بولی۔" ہاں۔ ہاں۔ تم کاہے کو فکر کرتے ہو۔ دونوں سمجھ دار ہیں، تم خیر سے جاؤ اور خیر سے گھر آؤ۔"

میلے میں رام نرائن کو توقع سے زیادہ دیر لگ گئی۔ بنارس کا میلہ ختم ہوا تو چند دنوں کے بعد سورج گرہن لگ گیا۔ گنگا اشنان کے لئے بنارس میں ہندوؤں کے ٹھٹ لگ گئے۔ دوکان خوب چل رہی تھی۔ اس لئے رام نرائن کچھ روز صبر کر کے ٹھہر گیا۔ میلے کا زور ٹوٹا اور ہجوم دھیرے دھیرے چھٹنے لگا تو اُس نے گنگا اشنان کیا اور چلنے کی تیاری کی، اُسی دن اُس کا ایک پُرانا دوست مل گیا۔ جو لنگوٹ کسے، جسم پر بھبھوت ملے بیراگی بن گیا تھا۔

اُس نے رام نرائن سے بڑے دُکھ کے ساتھ کہا:

" دنیا سوائے چھل کپٹ کے اور کچھ نہیں بھائی۔ یہ آنکھوں کے سامنے جو کچھ ہے سب دھوکا اور فریب ہے۔ کوئی باپ نہیں، کوئی بھائی نہیں، کوئی رشتہ نہیں۔ بھگوان کا رشتہ اٹوٹ ہے۔ بھگوان کی شکتی مہان ہے۔ گیان اور بھگوان ایک سچ، ایک حقیقت کا نام ہے۔ جس کے پیچھے کوئی لالچ کوئی مکر، کوئی استیہ نہیں۔ میں نے دنیا تیاگ کر ایک سچ کو اپنا لیا ہے۔"

رام نرائن کو اُس کی باتوں سے بڑی رُوحانی اور سچی خوشی حاصل ہوئی۔ اسی کے کہنے پر وہ پریاگ کو ہو لیا، اور وہاں سادھوؤں کی بھیڑ میں پندرہ بیس روز گذارنے کے بعد گھر واپس ہوا۔

دوسرے دن صبح وہ مولا باغ جانے کے لئے اُٹھا تو اُسے یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی کہ لکھن اور بیراج دونوں ٹانگ پر ٹانگ رکھے خراٹے لے رہے ہیں۔ گیانی کی باتیں اُس کے کانوں میں گونجنے لگیں۔

" یہاں کوئی باپ نہیں۔ یہاں کوئی بیٹا نہیں۔ کوئی بھائی نہیں۔ سارے رشتے جھوٹے ہیں۔ بھگوان کا رشتہ اٹوٹ ہے۔"

" ہاں دیکھو تو جوانی کے نشے میں اپنے باپ تک کو بھلا دیا دونوں نے"۔ وہ بڑبڑاتا ہوا اکیلے ہی مولا باغ کو روانہ ہو گیا۔ مولا باغ سے لوٹ کر آیا جب بھی بیراج کو لیٹے ہوئے دیکھا۔ اُسے اپنے بڑے لڑکے بیراج پر سخت غصہ آیا۔ مگر غصے کو پی کر وہ بڑی نرمی اور ملائمت سے بیراج کو جگانے لگا۔" اُٹھ نا بیراج، دیکھ تو پیروں میں دھوپ آ گئی ہے۔ یہ وقت سونے کا نہیں کام کرنے کا ہوتا ہے۔ جاگ بھئی۔"

مگر بیراج نے یہ کہتے ہوئے کروٹ بدل لی۔

" ہٹو بھی۔ انگ انگ ٹوٹ رہا ہے۔ میں اتنی جلدی نہیں اُٹھوں گا۔"

بیراج کی منہ زوری اور لہجے کی تلخی رام نرائن کیلئے ناقابلِ برداشت تھی۔ مگر وہ ضبط کئے رہا۔ اُس نے پوری چارپائی پر بیراج کے جسم کو پھیلے ہوئے دیکھ کر سوچا۔

" وہ اس سے کم تو نہ تھا۔ بلکہ آدھ ایک انچ پاؤں باہر ہی نکلتا تھا۔ شریر میں کہیں اس سے زیادہ جان تھی، مگر اس زبان میں کبھی اس نے اپنے باپ سے گفتگو نہ کی تھی۔ وہ تو بدری نرائن کی آواز پر یوں جاگ اُٹھتا تھا، جیسے بچھو نے ڈنک مار دیا ہو۔" وہ کچھ دیر گم سم بیراج کی چارپائی کی ادوائن پر بیٹھا حیرت اور خوف سے بیراج کو تکتا رہا۔" میرا لڑکا مجھ سے کتنا مختلف نکلا۔"

ناشتہ سے فارغ ہو کر جب وہ پھولوں کے ہار سمیٹ کر ٹوکری میں رکھ رہا تھا تو بیراج کمرے کے سامنے سے گنگناتا ہوا گذرا۔

" بھور بھئی لے رے پیا پردیسوا جیئے نا۔"

گیت کے بول سن کر رام نرائن کا خون کھول اُٹھا۔ وہ ٹوکری وہیں رکھ کر بڑے زور سے گرجا۔

" بیراج! اِیں گھر رنڈی کا نا ہئے۔ رام نرائن کا ہے۔ بدری نرائن کا ہے، سمجھے نا۔ آئندہ سے ایسے گیت گھر میں نہ سُنوں۔ ہاں۔" یہ کہہ کر وہ تیزی سے اُٹھا اور باہر نکل گیا۔ اُس کے چلے جانے کے بعد بڑی دیر تک گھر کے سناٹے میں اُس کی چیخ گونجتی رہی۔ اس گھر میں پہلی بار ایک آدمی چیخا تھا۔ اُس کی آواز بڑی دلخراش اور ہیبت ناک تھی۔ بیراج لکھن اور رکمنی کو تو سانپ سُونگھ گیا تھا۔

اُس نے بڑی بے دلی سے دکان کھولی۔ موتیا، چنبیلی کو گلاب اور ہار سنگھار سے الگ کر کے ایک طرف رکھ دیا۔ دو چار نقلی ہاروں کو دکان کے چھجے کی کھونٹیوں سے لٹکانے کے بعد خاموشی سے گدی پر بیٹھ گیا، اور الکساہٹ میں گجرے کے پھولوں پر پانی کے چھینٹے مارنے لگا۔

رہ رہ کر اس کی نظریں مغربی سمت اٹھتی تھیں۔ شاید بیراج بھاگتا ہوا آ رہا ہو۔ شاید وہ آ کر پیروں کو پکڑ لے۔ اور کہہ دے، بابا اب کی معاف کر دو۔ آئندہ سے تمہارے مزاج کے خلاف ایک بات بھی نہ کروں گا۔

انتظار ہی انتظار میں دوپہر ہوئی، اور پھر شام کی خنک اور ٹھنڈی تاریکی بجلی چوک کی پتلی سی پکی سڑک پر اُتر آئی، مگر بیراج نہ آیا۔ غصے اور دُکھ میں اُس نے دوپہر کا کھانا بھی نہ کھایا۔ کھانے کی پوٹلی پیتل کے چمچاتے برتن میں پڑی پڑی سُوکھ گئی۔ بجلی کی روشنی ہوئی تو پورا بازار جگمگا اُٹھا۔ کوٹھوں پر سازندے سازوں کو درست کرنے لگے۔ کبھی کبھی کسی ستار کے تاروں کی جھنجھناہٹ سے اس کا سر چکرا کر رہ جاتا۔ اور اس کے تمام جسم میں چنگاریاں سی سلگ اٹھتی تھیں۔ اس نے ایسا کبھی محسوس نہ کیا تھا۔ رات کے پہلے پہر کا آغاز سنجوگ کے گیت سے ہوا۔

" ابھی ابھی تو آئے ہو، بہار بن کے چھائے ہو۔"

ابھی نہ جاؤ چھوڑ کر۔ ابھی نہ جاؤ چھوڑ کر"

اس کی دکان پر روز کی طرح کئی لوگ ہار خریدنے آئے مگر وہ مطلوبہ ہار کے بجائے اُلٹے سیدھے پھولوں کے ہار دیتا رہا۔ اُس کی غائب الدماغی پر کئی لوگوں نے آوازیں بھی کسیں۔ مگر وہ خاموشی سے پھبتیاں سہہ کر معذرت کر لیتا:۔

" بھیا معاف کر دیو، طبیعت آج کچھ ٹھیک نہیں ہے"۔

وہ جلد ہی دکان بند کر کے گھر روانہ ہو گیا۔

گھر پر تو جیسے اماوس کی رات کی نحوست پھیلی تھی۔ ہر طرف اُداسی، ہر گوشے میں تاریکی۔ سیڑھیوں پر اُس کے قدموں کی چاپ سُن کر رکمنی دیا جلا کر خاموشی سے اُس کے پاس آ کر کھڑی ہو گئی۔ رام نرائن نے پھولوں کی ٹوکری ایک

طرف رکھ دی۔ گچھا اتار کر الگنی پر ٹانگ دیا اور بنا ایک لفظ نکالے چارپائی پر اوندھے منہ لیٹ گیا۔

رکمنی کو بیٹے کی بغاوت اور شوہر کے دُکھ کا بڑا گہرا احساس تھا۔ وہ برسوں سے اس گھر میں ایک شخص کی حکومت ایک روایت پسند انسان کی عملداری دیکھتی چلی آرہی تھی۔ جس کے فیصلے کے سامنے گھر کا ایک ایک فرد بلاچون و چرا سرِ تسلیم خم کرتا آیا تھا۔ رام نرائن سے پہلے اس گھر پہ بدری ناتھ کی حکومت تھی۔ بدری ناتھ سے پہلے اس گھر میں بدری نرائن کے پورکھوں کا راج تھا۔ مگر اب..... بیراج کی ایک ذرا سی بغاوت، معمولی سی حرکت سے روایت کا مضبوط قلعہ ڈانواں ڈول تھا۔ قلعہ کی ایک ایک فصیل لرز رہی تھی۔

رام نرائن نے سر اٹھا کر پوچھا: "لکھن کہاں ہے؟"

"سو رہا ہے"۔ رکمنی کی آواز کالے کوسوں سے آئی تھی۔

"اور بیراج ۔۔۔؟" رام نرائن کی آواز میں صدیوں کا دُکھ اور بے چارگی تھی۔

"ابھی تک نہیں آیا۔"

رام نرائن نے اس کا کچھ جواب نہ دیا۔ کروٹ بدل کر سو گیا۔ سونے کا تو اُس نے بہانہ کیا تھا بھلا آنکھوں میں نیند کہاں تھی۔ نیند تو اُسی دن آنکھوں سے اُڑ گئی تھی جس دن اُس نے بیراج کو مولا باغ میں "کاہے کو منوا میں آگ لگائے رے سنوریا" گنگناتے سنا تھا۔

بیراج کی ایک ذرا سی بغاوت سے روایت کا مضبوط قلعہ ڈانواڈول تھا

اب تو بیراج کی سنوریا کی لگائی ہوئی آگ میں اسکا تن بدن ہی نہیں کُل اثاثہ بھی جل رہا تھا۔ وہ بیراج کی موت ہنستے ہنستے برداشت کر لیتا مگر پورکھوں کے مان کی موت برداشت کرنے کا حوصلہ وہ اپنے میں نہیں پا رہا تھا۔

وہ رات بھر ننگی چارپائی پر پڑے پڑے ذہنی الاؤ کی تیز آنچ پر تڑپتا رہا۔ یہاں تک کہ بھور ہو گئی۔ اور منڈیر پر کوّے کائیں کائیں کرنے لگے۔ آنگن کے طاق پر رکھی ہوئی گنیش جی کی مورتی سورج اشنان کے لئے آنکھیں کھولے رام نرائن کی منتظر رہی۔ مگر رام نرائن کو تن من کا ہوش ہی نہ تھا۔ وہ چارپائی پہ بے سُدھ پڑا کھپریل کی چھت کے بانسوں کو گنتا رہا۔ پانی کے چھڑکاؤ کے بغیر رکمنی کے کمرے میں گجرے مرجھا گئے۔ اور ان پہ مکھیاں جھُولنے لگی تھیں۔

دن نکلا اور دھوپ آنگن میں گرنے لگی تو رکمنی رام نرائن کے قریب آکر بڑی ملائمت سے بولی:

"دُکان نہ جاؤ گے؟"

"آں ۔ ہاں"۔ کہہ کر وہ خاموشی سے اُٹھا، اور مُنہ دھونے چلا گیا۔ منہ دھو کر ابھی وہ اپنے گمچھے سے ہاتھوں کو پونچھ ہی رہا تھا کہ لکھن نے کہا۔ "بابا بیراج آیا ہے۔"

رام نرائن نے نگاہیں اٹھائیں تو سامنے سے بیراج چلا آتا تھا۔ اس کے پیچھے پیچھے سادہ لٹھے میں لپٹی ہوئی ایک عورت بھی تھی۔ رام نرائن کو محسوس ہوا جیسے آسمان اور زمین گردش میں آگئی ہے۔ اس کا سر تیزی سے چکرایا۔ اگر دیوار پکڑ نہ لیتا تو دھڑام سے فرش پر گرتا۔

بیراج رام نرائن کے قریب آکر بولا۔ "بابا۔ یہ ساوتری ہے، رام داس کی لڑکی۔ رات میں اس کے گھر تھا۔ میں اسے دھرم پتنی بنانا چاہتا ہوں۔ تم سے اشیرباد لینے آیا ہوں۔"

رام نرائن سے کچھ کہتے بن نہ پڑا۔ اس کی نظروں کے سامنے بس ایک ہی منظر تھا۔ کیلاش کی سفید پوش چوٹیوں پر شیو مرتیو (موت اور تباہی) رقص میں مست تھے۔ ہر چیز اُلٹ رہی تھی۔ ہر شے تلے اوپر گر رہی تھی۔ ٹوٹ رہی تھی۔ غرق ہو رہی تھی۔ ختم ہو رہی تھی۔

"بابا۔ بابا۔ میں جا رہا ہوں۔" بیراج کی آواز بہت دُور سے سنائی دی۔ وہ چونک پڑا۔ بیراج اور ساوتری اشیرباد کا انتظار کئے بغیر باہر نکل رہے تھے۔!!

ڈبہ پیروں سے ہوشیار



جعلی پیروں کے ہاتھوں ہزاروں خاندان تباہ ہو گئے

علی مراد نوجوان اور شادی شدہ تھا. اس کی بیوی کی گود ابھی ہری نہ ہوئی تھی، دونوں کے درمیان اس مسئلہ پر کوئی رنجش نہ تھی۔ تاہم میاں بیوی دونوں اپنی اپنی جگہ اس خواہش کی آگ میں جل رہے تھے کہ ان کے گھر میں ہنستا کھیلتا ہوا بچہ آ جائے. اس خواہش نے دونوں کو توہم پرستی میں مبتلا کر دیا تھا۔ اس کی بیوی خاص طور پر کسی ایسے شخص کی ٹوہ میں رہتی جو اسے تعویذ گنڈوں سے بچے کی آمد کا یقین دلا دے۔ دیہی علاقہ ہونے کی وجہ سے عورتوں میں ایک عام خیال تھا کہ ایسے موقعوں پر پیر فقیر کام آتے ہیں۔ اس کمزوری سے فائدہ اٹھا کر اکثر جعلی پیر سیدھی سادی، معصوم عورتوں کو بیوقوف بنا کر سینکڑوں روپیہ بٹور کر لے جاتے ہیں.

علی مراد کی بیوی جمیلہ نے کئی بار اس بات کا ذکر اپنے شوہر سے کیا۔ لیکن علی مراد مذہبی آدمی ہونے کے باوجود اس خیال کا مخالف تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ "جو کچھ مانگنا ہے خدا سے مانگو۔ وہ قادر مطلق ہے، ہر چیز پر قادر، کسی انسان کے بس کی یہ بات نہیں"۔ تاہم وہ اپنی بیوی کا دل رکھنے کے لئے یہ بھی کہتا ہے کہ "اگر واقعی اللہ کا کوئی خاص بندہ مل جائے تو اس کی دعائیں کام آ سکتی ہیں — ویسے جعلی پیروں فقیروں سے بچ کر رہنا کیونکہ وہ اس قسم کا کاروبار کرتے ہیں۔ بعض دفعہ وہ گھر کا سامان لے کر بھاگ نکلتے ہیں۔ یہ لوگ ہم جیسے غریبوں کی سادگی سے خوب فائدہ اٹھاتے ہیں"۔ جمیلہ کو اپنے شوہر کی باتیں درست معلوم ہوتیں، لیکن وہ ان پر عمل نہ کرتی۔ اکثر وہ کسی پیر کا نام سن کر محلے کی سادہ لوح عورتوں کے ساتھ چلی جاتی۔ واپس آ کر تعویز کو پانی میں گھول کر کبھی خود پیتی اور کبھی اپنے شوہر کو پلاتی۔ اس نے شوہر کی محنتوں سے کمائی ہوئی رقم کا ایک بڑا حصہ ان جعلی پیروں پر خرچ کر دیا۔

> اس نے اپنے مرید کی نوجوان اور خوبصورت بیوی کو اغوا کر لیا

ایک دن، پڑوس کی ایک عورت نے اُسے بتایا کہ گاؤں میں ایک پیر آیا ہوا ہے۔ بڑا دعویٰ کرتا ہے۔ چلو چل کر اُسے دکھا دو، شاید تمہاری مراد پوری ہو جائے۔

چالاک پیر نے جمیلہ سے اس کے شوہر، اس کی آمدنی اور گھر کے بارے میں معلومات حاصل کیں۔ اس کے بعد اُس نے مشورہ دیا کہ چونکہ تمہارا شوہر پیروں پر پختہ عقیدہ نہیں رکھتا، اس لئے تم ابھی تک بچہ سے محروم ہو، تمہارے گھر پر نحوست کا سایہ ہے، جب تک پورے گھر کی جھاڑ پھونک نہ کی جائے گی۔ اُس وقت تک نحوست کا سایہ نہیں ٹلے گا۔ سب سے پہلے میں تین روز کا چلّہ کاٹوں گا، چوتھے روز تمہارے گھر ایسے وقت آؤں گا جب تمہارا شوہر گھر پر موجود نہ ہو گا۔ تاکہ اطمینان کے ساتھ جھاڑ پھونک کر سکوں۔ چلّہ کے لئے مجھے ایک سیاہ رنگ کے بکرے کی قربانی دینی ہو گی۔ اور تقریباً پانچ گز کورا لٹھا درکار ہو گا۔ جمیلہ نے اُسے پچاس روپے دیتے ہوئے کہا "آپ میرا کام کر دیں، مجھ سے جو کچھ ہو سکے گا خدمت کروں گی"۔

اس واقعہ کے چوتھے روز جعلی پیر جمیلہ کے گھر پہنچ گیا۔ اُس کا شوہر باہر جا چکا تھا۔ اُس نے پورے

سادہ لوح دیہاتی توہم پرستی کی وجہ سے

ڈبہ پیروں کے چنگل میں پھنس جاتے ہیں

گھر کا جائزہ لیا۔ آخر میں جادو ٹونے کے لئے اس کمرے کو پسند کیا جس میں قیمتی سامان، صندوق اور اس میں جمیلہ کے زیورات پڑے ہوئے تھے۔ اس نے جمیلہ کو ہدایت کی کہ وہ باہر ہی ٹھہرے، اور خود اندر پہنچنے کے بعد دروازہ کی چٹخنی چڑھا دی۔ جمیلہ اور اس کی پڑوس کی عورتیں پیر جی کے جلالی چہرے سے خاصی مرعوب تھیں۔ وہ باہر ہی بیٹھ کر پیر کا انتظار کرنے لگیں۔ اندر سے جعلی پیر کے کچھ پڑھنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ اس کی آواز میں اتنی شیرینی اور مٹھاس تھی کہ عورتوں پر وجد کی کیفیت طاری ہو گئی۔ جعلی پیر کم و بیش ایک گھنٹہ کے بعد دروازہ کی چٹخنی کھول کر باہر نکلا۔ ... کے چہرے پر پسینے کے قطرے چمک رہے تھے۔ سیاہ داڑھی لرز رہی تھی۔ اس نے باہر نکلتے ہی دروازہ پر کچھ پڑھ کر پھونک ماری۔ اور جمیلہ سے کہا کہ "وہ نصف گھنٹہ کے بعد کمرے میں جائے گی۔ اس سے پہلے گئی تو تعویذ کا اثر زائل ہو جائے گا۔" یہ ہدایت دیکر جعلی پیر چلا گیا۔

نصف گھنٹہ کے بعد جب جمیلہ کمرہ میں گئی تو اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ سارا سامان اِدھر اُدھر بکھرا پڑا تھا۔ صندوق کھلے ہوئے تھے۔ اور اس کے زیورات کی پوٹلی غائب تھی۔ اُس نے سینے پر دو ہتھڑ مار لیا۔ "ہائے ہائے میں لٹ گئی۔ میرا سارا زیور غائب ہو گیا"

یہ واقعہ شہداد کوٹ کے ایک گاؤں میں پیش آیا تھا۔ گاؤں والوں نے ایک ایک جگہ تلاش کی، مگر جعلی پیر گدھے کے سر سے سینگ کی طرح غائب تھا۔ دوسرا واقعہ گھوٹکی میں پیش آیا۔ جو پہلے واقعہ سے کہیں زیادہ عبرت انگیز ہے۔

شہزادہ ایک میڈیکل اسٹور پر ملازم تھا۔ وہ اور اس کی بیوی ایک پیر کے مرید تھے۔ چند دنوں سے اسکا پیر اس کے گھر میں ٹھہرا تھا۔ وہ صبح اپنی دکان پر چلا جاتا۔ اُدھر جعلی پیر کو خوبصورت اور نوجوان بیوی کو رجھانے کا موقع مل جاتا۔ ایک ہفتہ کے قیام کے دوران جعلی پیر نے شہزادہ کی بیوی پر ایسا رنگ چڑھایا کہ وہ ایک دن چپکے سے اپنے زیورات لے کر جعلی پیر کے ساتھ فرار ہو گئی۔ پولیس نے شوہر کی رپورٹ پر جعلی پیر اور مغویہ کی تلاش میں رات دن ایک کر دیا۔ مگر وہ نہ ملے۔

ایسے سینکڑوں مرد اور عورتیں اس قسم کے جعلی اور ڈبہ پیروں فقیروں کے ہاتھوں لٹ جاتے ہیں۔ اب تک ہزاروں خاندان تباہ و برباد ہو چکے ہیں۔ جعلی پیر سیدھی سادی معصوم عورتوں کو ورغلا کر لے جاتے ہیں۔ اور انہیں فروخت کر کے اپنی راہ لیتے ہیں۔ اس طرح عورتیں مختلف ہاتھوں سے گزرتی ہوئی ایسی جگہوں میں پہنچ جاتی ہے۔ جہاں انہیں زندگی بھر ذلت اور رسوائی کے سوا کچھ نہیں ملتا۔ ہمارے ملک میں اس قسم کے ڈبہ پیروں کا باقاعدہ ایک منظم گروہ ہے، جو اپنا حلیہ تبدیل کر کے شہروں اور گاؤں میں پھیل جاتے ہیں۔ اور پیری مریدی، تعویذ گنڈوں کی آڑ میں مکروہ کاروبار کرتے ہیں۔ چونکہ شہروں میں عام طور سے پڑھے لکھے لوگ رہتے ہیں، اس لئے وہ ان کے جھانسے میں بہت کم آتے ہیں، پھر بھی شہروں میں اس قسم کے واقعات رونما ہوتے رہتے ہیں۔ البتہ گاؤں اور قصبوں میں ان کا جادو خوب چلتا ہے، جہاں اَن پڑھ اور سیدھے سادے لوگ آباد ہیں۔ چونکہ گاؤں والے توہم پرستی کے زیادہ قائل ہوتے ہیں۔ اس لئے جعلی پیر بڑی آسانی سے انہیں اپنا شکار بنا کر خوب ٹھگتے ہیں۔

اِن دنوں سندھ کے دیہی علاقوں میں ایسے ڈبہ پیروں کی سرگرمیاں بڑھ گئی ہیں۔ اس لئے صوبائی حکومت کو اُن کے خلاف مؤثر کارروائی کرنی چاہیئے۔ تاکہ معاشرے کو ایسے مجرموں سے پاک کیا جا سکے۔ عوام کو بھی چاہیئے کہ وہ عقائد کے معاملے میں اپنی آنکھیں اس قدر بند نہ کر لیں، کہ وہ اچھے اور بُرے میں تمیز نہ کر سکیں۔ اِس بات سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ یہ دُنیا اچھے لوگوں سے خالی ہو گئی ہے، تاہم جعلی پیروں سے ہوشیار رہنا چاہیئے۔

کیا آپ معیاری کتابوں کی تلاش میں ہیں ؟

الفتح مطبوعات

شنگھائی کی عورتیں ———— نورے زیتر ھوم
قیمت ۳ روپے
ترجمہ : جمیل الدین عالی — فضل صدیقی

اور

عظیم المیہ ———— ذوالفقار علی بھٹو
مجلد ۴ روپے
غیر مجلد ۲ روپے

اپنے قریبی بک اسٹال سے طلب کیجئے یا ہم سے منگوائیے

الفتح مطبوعات

۸۷ - ڈی ، پی ای سی ایچ ایس - کراچی ۲۹

کراچی ٹیلیویژن پر

"یحییٰ خاں" چل گیا



پاک چین تعلقات کو خراب کرنے کی کوششوں میں مصروف بھارتی ایجنٹ



ایک عرصے کے بعد کراچی کے شہریوں نے پاکستان کے "بطلِ جلیل" جنرل آغا محمد یحییٰ خاں کو ٹیلی ویژن کی سکرین پر بصد طنطنہ جلوہ آرا ہی نہیں بلکہ شوقِ خطابت کرتے دیکھا۔

ناظرین و سامعین حیران بلکہ پریشان کہ ایکا ایکی ٹیلیویژن والوں کو کیسے اس "عظیم" لیڈر کی یاد آگئی اور کس اہتمام سے یہ فلم دکھاتی ہے۔ کہ کاٹ نہ چھانٹ، دیکھنے والے انتظار میں تھے کہ شاید ابھی فلم کٹ جائے گی اور لکھا ہوا آئے گا کہ "انتظار فرمائیے"۔ مگر قربان جائیے ٹیلیویژن والوں کے، کہ انہوں نے بالکل ایسی زحمت ہی نہیں کی۔ اور کراچی والوں کو موقع دیا کہ وہ جی بھر کے نظارہ کر لیں۔ پھر یہ موقع ملے نہ ملے۔

ریڈیو، ٹیلی ویژن میں سنا ہے کہ ڈیوٹی آفیسر نام کی ایک چیز ہوتی ہے، جس کا فرض یہی ہوتا ہے کہ پروگرام سنتا رہے اور دیکھتا رہے، ایسی کوئی گڑبڑ ہو، تو اسے مکمل اختیار ہوتا ہے کہ وہ پروگرام کو وہیں کاٹ دے۔ اس روز ٹیلی ویژن کے ڈیوٹی آفیسر جانے کس مصروفیت میں الجھے ہوتے تھے۔ کہ انہیں اس کی فرصت ہی نہیں ملی۔

ٹیلی ویژن اسٹیشن پر بھی ٹیلی فونوں کا تانتا بندھ گیا۔ اور اخبارات کے دفتروں میں بھی فون آنے لگے۔

کہ کیا یحییٰ خاں کو رہا کیا جا رہا ہے۔

کیا اسکے لئے راہ ہموار کی جا رہی ہے۔؟

اس عمل سے دو شکار ہوتے، پاک چین دوستی، اور دوسرے موجودہ حکومت۔

اب سنئیے کہ اصل واقعات کیا ہیں۔ جو ہم نے اپنی تحقیقات سے جمع کئے ہیں۔ کہ چینی فوجی وفد کے خیر سگالی کے دورے کے سلسلے میں ایک پروگرام پنڈی سے تیار ہو کر آنا تھا۔ وہ پروگرام نہیں پہنچا۔ پنڈی ٹیلی ویژن والوں کی گڑبڑ یا پی آئی اے کی۔ بہر حال پروگرام شام تک نہیں پہنچا۔ ایسے میں ہمیشہ کوئی متبادل پروگرام محفوظ رکھا جاتا ہے۔ اس پروگرام کو پہلے سے چلا کر دیکھ لیا جاتا ہے کہ کوئی گڑبڑ تو نہیں ہے۔ ہماری معلومات کے مطابق، ایک پروگرام "جریدہ" نکالا گیا۔ اور دوسرا پروگرام، اس روز کے پریزنٹیشن کنٹرولر اور سینئر پروڈیوسر امیر امام نے نکالا۔ اور بتایا کہ یہ "ورلڈ ٹونائٹ" کا پروگرام ہے۔ اور پاک چین تعلقات پہ ہے، پریزنٹیشن کنٹرولر کو ڈیوٹی آفیسر سمجھ لیجئے۔ جو تمام نشریات کے بارے میں ذمہ دار ہوتا ہے، ان کا فرض تھا کہ پہلے سے اسے چلا کر دیکھ لیتے، انہوں نے معلوم نہیں ایسا کیا کہ نہیں۔ بہر حال انہوں نے اس پروگرام کو ٹیپ پر چڑھا دیا، اندرونی ذرائع کے مطابق پروگرام سے آٹھ دس منٹ پہلے بھی یہ بات چیت سنائی دی کہ اسے پہلے دیکھ لو۔ سینئر پروڈیوسر نے کہا۔ کوئی بات نہیں، ٹھیک ہے، خیر صاحب پروگرام کا وقت ہو گیا، پروگرام چلا، جاوید جبار صاحب حالاتِ حاضرہ پہ تقریر فرما رہے تھے، اور کچھ منٹ بعد عزت مآب آغا محمد یحییٰ خاں جلوہ افروز ہوئے، کنٹرول روم کے انجینئروں کے ہاتھوں کے

ویتنام کے بارے میں امریکی نقطۂ نظر لفظ پیش کیا جاتا ہے

طوطے اڑ گئے۔ وہ چیخے، "یحییٰ خاں چل گیا" ایک انجینئر دوڑا بھاگا۔ امیر امام صاحب کے پاس پہنچا، جو ساتھ ہی لابی میں کھڑے کوئی ریہرسل کر رہے تھے۔

"امیر صاحب! یحییٰ خان چل گیا ہے۔"

"تو کیا ہوا۔"

"بند کر دیں۔"

"نہیں چلنے دو۔"

انجینئر پریشان حال واپس آیا۔ پھر ایک صاحب آئے جنہیں ٹرانسمیشن کنٹرولر کہتے ہیں۔ وہ امیر امام صاحب ـــــ نمبر۲ ہیں۔ ان سے کہا گیا کہ یحییٰ خان چل رہا ہے۔ پریزنٹیشن کنٹرولر سے بات کرو۔ وہ بھاگا بھاگا گیا تو امیر امام صاحب سکرپٹ ایڈیٹر افتخار عارف کے پاس بیٹھے تھے۔ حالانکہ ان کی ڈیوٹی تھی کہ کسی ٹیلی ویژن سیٹ کے سامنے ہوتے، مگر وہ افتخار عارف کے سامنے تھے اور جانے کیا سرگوشیاں کر رہے تھے۔ ٹرانسمیشن کنٹرولر پہنچا "سر! یحییٰ خان چل رہا ہے۔"

"کہہ جو دیا ہے چلنے دو" امیر امام صاحب کا جواب تھا۔

"بند کروا دیں۔"

پریزنٹیشن کنٹرولر نے کہہ جو دیا ہے چلنے دو ذمہ دار یہ ہیں یا آپ ہیں۔" یہ افتخار عارف صاحب کا جواب تھا۔

اتنے میں فلم کا وقت پورا ہو گیا، یحییٰ خان چل گیا تھا۔ پورا کراچی حیران تھا، پریشان تھا۔ ٹیلی فونوں کا تانتا بندھ گیا، مگر امیر امام صاحب نے ٹیلی فون آپریٹر کو منع کر دیا کہ ان سے کوئی فون نہ ملوائیں۔ جنرل مینجر صاحب جو پروگرام سے چند منٹ پہلے گھر گئے تھے۔ وہ بھی دوڑے بھاگے ٹیلی ویژن پہنچے۔ مگر جو ہونا تھا ہو چکا تھا۔ ہیڈ کوارٹرز کو اطلاع مل گئی تھی جنرل مینجر اور پریزنٹیشن کنٹرولر معطل کر دیتے گئے۔

سوچنے والے سوچ رہے ہیں کہ یہ سب کچھ یونہی اچانک اور نادانستہ ہوا ہے۔ یا سب کچھ سوچ سمجھ کر ہوا ہے۔ دوسرے پہلو کو تقویت اس بات سے پہنچی ہے کہ ٹرانسمیشن کے ذمہ دار امیر امام صاحب نے پروگرام کے دوران فلم کو کیوں نہیں کاٹا۔ اگر انہیں پتہ چل گیا تھا تو اسے رکوا دیتے۔ مگر انہوں نے معلوم ہو جانے کے بعد بھی اسے چلنے دیا۔ اسی سے یہ پتہ بھی ہوتا ہے کہ انہوں نے یہ پروگرام پہلے سے دیکھا بھی ہو گا اور جان بوجھ کر چلایا ہو گا، کیونکہ اس سے پہلے بھی وہ ایسی حرکت کر چکے ہیں۔ جیسا کہ انگریزی روزنامے "مارننگ نیوز" میں اس واقعے کے تیسرے روز راولپنڈی کے نمائندے کے حوالے سے خبر شائع ہوئی ہے کہ انہی سینئر پروڈیوسر سیّد امیر امام صاحب نے ایک فلم چلوائی۔ جو "تائیوان اوپیرا" سے متعلق ہے۔ اور یہ اتفاق سے راولپنڈی میں اس روز چلی جب چینی فوجی وفد پنڈی میں موجود تھا۔ یہ فلم کراچی سے گئی تھی۔ غیر ملکی ٹیلی ویژن والے تو فلمیں بھیج دیتے ہیں، اسے مقامی طور پر دیکھنا ہوتا ہے کہ پالیسی کے مطابق ہے یا نہیں۔ اس فلم کا اسکرپٹ بھی ساتھ تھا۔ اس پر "تائیوان" جلی حرفوں میں لکھا تھا۔ اسکرپٹ ایڈیٹر افتخار عارف صاحب نے اسے او کے کیا۔ اور اسکرپٹ کو منظور کر لیا۔ اس کے بعد انجینئروں نے اس پر اعتراض کیا کہ "تائیوان اوپیرا اور پاکستان ٹیلی ویژن سے ہے۔

امیر امام صاحب نے کہا کوئی بات نہیں اسکرپٹ او کے ہو گیا ہے۔ میں کیا کروں۔ انہوں نے جانتے بوجھتے اسے چلایا۔ یہی فلم پنڈی چلی تو پاک چین سفارتی تعلقات خطرے میں پڑ گئے، پاکستان کے محکمۂ خارجہ کو سفارتی سطح پر معذرت کرنا پڑی۔

> ٹیلی ویژن جیسے
> قومی ادارے میں
> پاکستان کی خارجہ
> پالیسی سے نابلد
> افراد کو کب تک
> برداشت کیا جاتے گا؟

ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ اتنے بڑے واقعے اور پاک چین دوستی کو سبوتاژ کرنے کی اس خطرناک کوشش کے بعد تائیوان اوپیرا کا اسکرپٹ او کے کرنے والے اسکرپٹ ایڈیٹر اور اس فلم کی پیش کش کرنے والے سینئر پروڈیوسر امیر امام کو ایسے ذمہ دار عہدوں پر کیوں رکھا گیا۔ اگر ان کے خلاف اس وقت ہی کوئی کارروائی کر لی جاتی۔ تو کراچی کے شہری، پاکستان کی عزت اور آبرو کو خاک میں ملانے والے مردِ ذلیل آغا محمد یحییٰ خان کی منحوس شکل نہ دیکھتے۔ ٹیلی ویژن جیسے قومی ادارے میں ایسے سازشی لوگوں کا وجود کیسے برداشت کیا جا رہا ہے؟

دلوں کا حال تو خدا جانتا ہے، مگر ان دو بھیانک واقعات کے بعد بہت سے پرانے وسوسوں اور اندیشوں کو تقویت پہنچتی ہے۔ جو سکرپٹ ایڈیٹر افتخار عارف اور سینئر پروڈیوسر امیر امام کے بارے میں پائے جاتے تھے۔ یہ دونوں حضرات یحییٰ خان کے زمانے میں اپنے آپ کو علی الاعلان "دائیں بازو" سے وابستہ کیا کرتے تھے۔ اور پیپلز پارٹی کو نیچے سقط سناتے تھے۔ اس سے ٹیلی ویژن کے مینیجنگ ڈائریکٹر اسلم اظہر اچھی طرح واقف ہیں، کیونکہ اس وقت وہ کراچی کے جنرل مینجر ہوتے تھے۔

یہ دونوں حضرات ۱۹۶۵ء کے آس پاس ہندوستان سے پاکستان آئے۔ ۱۹۶۷ء تک پاکستان کی شہریت حاصل کرنے کے چکّر میں رہے۔ اب بھی معلوم نہیں کہ ان کو یہ شہریت مل چکی یا ابھی تک بھارتی شہری ہیں۔ افتخار عارف صاحب ہندی میں ایم اے ہیں۔ یہ جنگ ستمبر ۱۹۶۵ء کے بعد پاکستان آئے تھے۔ اتنی دیر بعد انہوں نے بھارت سے پاکستان آنا کیوں ضروری سمجھا۔؟ اور پھر واپسی کے فوراً بعد وہ ایسے ذمہ دار عہدوں پر کیسے پہنچ گئے۔ ۱۹۶۷ء میں کراچی ٹیلی ویژن شروع ہوا تھا۔ ٹیلی ویژن ایک انتہائی نازک اور حسّاس ذریعہ ہے۔ یہاں سبوتاژ کے بڑے امکانات ہیں۔

ہم یہ الزام نہیں لگا رہے ہیں اور نہ تصوّر ہی کر سکتے ہیں۔ لیکن ذہن سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ کوئی بیرونی طاقت پسِ منظر میں کارفرما ہو۔ کہ ایک پروگرام سے پاک چین تعلقات خراب ہوتے ہوتے بچتے ہیں۔ تائیوان کی فلم چلانا ایسا ہی ہے کہ چین والے بنگلہ دیش کی کوئی فلم چلا دیں۔ دوسرے پروگرام سے موجودہ حکومت کے خلاف فضا تیار ہو گئی۔ ایسے لوگ تو کسی وقت بھی کچھ کر سکتے ہیں۔ ہم

باقی صفحہ ۳۱ پر

گوٹھ حاجی موسیٰ میں وڈیروں کی دہشت گردی

غازی مختار

۱۳ اور ۱۴ دسمبر کی درمیانی سرد رات کو گوٹھ حاجی موسیٰ کا ایک نوجوان ہاری علی محمد کھوکھر اپنے کھلیان میں رکھوالی کے لئے گوٹھ سے آدھ میل دور زمین پر بستر لگائے سردی سے سکڑا سمٹا پڑا تھا گوٹھ میں اس کے بھائی بند اور چھوٹے چھوٹے بچے چیتھڑوں میں لپٹے میٹھی نیند سو رہے تھے کہ آدھی رات کے قریب علی محمد کھوکھر کی دردناک چیخوں سے سارا گاؤں جاگ گیا۔ ماؤں کے ہڑبڑا کر اٹھنے سے معصوم بچے چلانے لگے۔ گاؤں کے چند جوان اور بوڑھے کلہاڑیاں لاٹھیاں لے کر اندھیرے میں فصلوں اور جھاڑیوں میں الجھتے کھلیان کی طرف دوڑ پڑے کھلیان میں پہنچنے پر انہوں نے دیکھا کہ علی محمد کھلیان میں لہولہان بے ہوش پڑا ہے۔ سر سے خون بہہ رہا ہے۔ اور بایاں کان بھی آدھا کٹ کر لٹک رہا ہے۔ قریب کوئی موجود نہیں، نبضیں ٹٹولیں تو ابھی زندگی کی ڈوری چل رہی تھی۔ لوگوں نے خون بند کرنے کی کوشش کی اور اس کوشش میں اُن کے ہاتھ بھی علی محمد کے خون میں سرخ ہو گئے۔ ایک آدمی دوڑ کر گاؤں سے بیل گاڑی لایا اور علی محمد کو اسی بستر میں لپیٹ کر گاڑی پر ڈال دیا گیا اور یہ قافلہ چھ میل دور کنری شہر کی طرف روانہ ہو گیا۔

صبح چار بجے بیل گاڑی پولیس تھانہ کنری کے سامنے رکی۔ لوگوں کی فوری امداد سے باندھی گئی پٹیوں سے علی محمد کے خون کے اخراج میں کافی کمی آگئی تھی۔ علی محمد نے نقاہت سے آنکھیں کھول دیں۔ خود علی محمد نے پولیس کو بیان دیا اور بتایا کہ وہ کھلیان میں سو رہا ہوا تھا کہ اچانک کسی نے اسے چارپائی پر مضبوطی سے جکڑ لیا۔ اس نے آنکھیں کھولیں تو آدھی رات کی مدھم چاندنی میں اس نے اس شخص کو پہچان لیا وہ وڈیرہ کامدار کرشن کوہلی تھا۔ اس نے خود کو چھڑانے کی جدوجہد کی تو کھٹاک کی آواز سے اس کے سر پر قیامت ٹوٹ پڑی اور اس کی چیخ نکل گئی۔ چندھیاتی آنکھوں سے پیچھے دیکھا تو وڈیرہ شمس الدین اس پر دوسرا وار کرنے کے لئے کلہاڑی کو حرکت دے چکا تھا۔ اسی وقت اس کی نظر تیسرے آدمی پر پڑی جو کچھ دور کھڑا تھا جسے وہ اندھیرے اور چوٹ لگنے کے سبب پہچان نہ سکا۔ کلہاڑی کے دوسرے حملے سے اس کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا اور پھر اس کے سارے بدن پر لگاتار دھماکے ہونے لگے اور وہ چیختے چیختے بے ہوش ہو گیا۔ پولیس نے زخمی کی مخدوش حالت دیکھ کر اسی وقت میرپور خاص سول ہسپتال میں داخلے کے لئے لیٹر بنایا اور مریض کو فوری طبی امداد کے لئے ابن سینا ہسپتال پہنچا دیا۔ اس وقت تک مریض کا سر اور گردن سوج گئے تھے اور بائیں ہاتھ پر بھی سوجن پیدا ہو گئی تھی۔

دوپہر تک زخمی کو جیپ میں ڈال کر میرپور خاص سول ہسپتال پہنچا دیا گیا۔ میرپور پہنچتے پہنچتے زخمی کی حالت بے حد خطرناک ہو گئی بے ہوش علی محمد کا سانس اکھڑنے لگا تھا مگر ڈاکٹروں نے آپریشن کر کے خون کا اخراج روک دیا اور مریض صبح تک خطرہ سے باہر آگیا۔

دوسری طرف پولیس ضروری کاغذی کارروائی کے بعد گوٹھ حاجی موسیٰ کے لئے روانہ ہونے لگی کہ بڑے لوگوں کے ٹیلیفون کا تانتا بندھ گیا۔ ہر بڑا آدمی لے۔ ایس۔ آئی (کنری تھانہ میں دو ماہ سے ایس ایچ۔ او نہیں ہے) کو علی محمد کی رپورٹ لینے پر سخت سست کہہ رہا تھا۔ اور دباؤ ڈالا جا رہا تھا کہ اے ایس وڈیرے کو گرفتار کرنے کی کوشش نہ کرے بلکہ ہو سکے تو معاملہ ہی ختم کر دے۔ اے۔ ایس۔ آئی نے مجبوری ظاہر کی کہ وہ رپورٹ درج کر چکا ہے بلکہ فریادی فرسٹ رپورٹ کی نقل بھی لے چکے ہیں۔ وہ رپورٹ داخل کرنے پر اس لئے بھی مجبور تھا کہ زخمی کی حالت بے حد خراب ہے اس کے مرنے کا زیادہ امکان ہے، پولیس رپورٹ داخل ہونے کے بارہ گھنٹے بعد تقریباً شام ساڑھے چار بجے کنری سے گوٹھ حاجی موسیٰ روانہ ہوئی۔ حالانکہ فرسٹ رپورٹ میں لکھا تھا کہ پولیس بروقت گوٹھ حاجی موسیٰ روانہ ہو گئی تا کہ جائے واردات کا معائنہ کرے اور مجرمین کو گرفتار کرے۔ پولیس نے شام پانچ بجے جا کر جائے واردات کا معائنہ کیا اور کاغذی کارروائی کر کے واپس آگئی کیونکہ ملزم اپنے ساتھیوں سمیت علاقہ کے ایک دوسرے رئیس کے ہاں جا کر پناہ حاصل کر چکا تھا۔ اور شاید پولیس بھی یہی چاہتی تھی۔

اس افسوسناک واقعہ کا پس منظر یہ ہے کہ گوٹھ حاجی موسیٰ کے بیس ہاریوں نے وڈیرہ عمر اور شمس الدین (جو دونوں سگے بھائی ہیں) کے خلاف چند ماہ پہلے سمارو ٹریبونل میں کیس داخل کیا تھا کہ زمینداران کے گزشتہ اور اس سال کی فصل کا حق نہیں دے رہا ہے۔ مختیار کار ہر پیشی پر ہاریوں کو برا بھلا کہتا رہا اور ہمیشہ ہاریوں سے کہا کہ وڈیرے سے جھگڑا مت کرو، جو دے لے لو۔ ایک دفعہ مختیار کار نے کہا کہ "بھٹو نے تمہارے دماغ خراب کر دیئے ہیں، وڈیرے کے بن جاؤ یا پھر بھٹو سے جا کر حساب لو۔ میں تم سب کو جیل بھیج دوں گا۔ جاؤ دفع ہو جاؤ۔"

ہاریوں نے سمارو میں ڈی سی کی کھلی کچہری میں درخواست دی پھر میرپور خاص میں وزیر اعلیٰ ممتاز علی بھٹو کے پاس حاضر ہوئے اور آخر کیس ڈی سی تھرپارکر کے پاس پہنچا۔ ڈی۔ سی نے وڈیرے عمر کو سختی سے حکم دیا کہ ہاریوں کے حقوق ادا کئے جائیں اور تسلی دی دوسری پیشی میں ڈی۔ سی نے رئیس عبداللہ خان۔ پیر عبدالغفور جان سرہندی (ہاری لیڈر) اور حاجی محمد ابراہیم مومن کو دونوں فریقین کی منظوری سے ثالث مقرر کیا اور سرکاری لیٹر کے ذریعہ حکم دیا کہ موقعہ پہ جا کر زمین کا

معائنہ کر کے اور حساب کتاب دیکھ کر فیصلہ کریں اور ۷ دسمبر کی پیشی دے دی۔ وڈیرے بھاگے اور مختیار کار سا مارو کو کچھ دے دلا کر کپاس کی فصل کھڑی ہونے کا سرٹیفکیٹ لینا چاہا۔ ۲ دسمبر کو مختیار کار گوٹھ حاجی موسیٰ میں گیا۔ اور ہاریوں سے کاغذات پر دستخط کرنے کو کہا مگر ہاریوں نے دستخط کرنے سے انکار کیا۔ ہاریوں نے مختیار کار کو کہا کہ ہماری ساری کپاس چُنی جا چکی ہے، ہم دستخط نہیں کریں گے ۴ دسمبر کو ثالث آئیں گے وہ خود دیکھ لیں گے۔ مختیار کار ناکام واپس لوٹ گیا۔ دوسرے دن سپیشل واڈ سپروائزر اور مختیار کار کا ہیڈ منشی آئے اور ہاریوں سے زبردستی دستخط کرانے چاہے مگر ہاریوں نے دستخط کرنے سے انکار کر دیا۔

۴ دسمبر کو پیر عبدالغفور جان سرہندی اور حاجی محمد ابراہیم موسیٰ گوٹھ حاجی موسیٰ پہنچ گئے۔ تیسرے ثالث رئیس عبداللہ خان (جو وڈیرے کی طرف سے تھے) نہیں پہنچے تھے۔ ثالثوں نے وڈیرے کو بلوایا مگر وہ نہیں آیا بلکہ اس نے جیپ بھیج کر رئیس عبداللہ خان کو بلوایا۔ اس وقت معزز ثالثوں نے ہاریوں کی ساری زمین کا گھوم پھر کر معائنہ کیا اور کاغذات تیار کئے۔ کہیں بھی کپاس کا بغیر چُنا کھیت نہیں تھا۔ ایک نقل ہاریوں کو دے دی گئی۔

۷ دسمبر کی پیشی میں وڈیرہ نے مختیار کا سا مارو کا سرٹیفکیٹ پیش کیا اور ہاریوں نے ثالثوں کے کاغذات کی نقل داخل کی۔ وہاں رئیس عبداللہ خان نے ہاریوں سے کہا کہ آپ لوگ آئندہ تاریخ لے لیں اور ابھی چل کر پیر عبدالغفور جان سرہندی کے پاس فیصلہ کرتے ہیں۔ اس وقت ۲۰ دسمبر کی تاریخ لے لی گئی اور ثالثوں نے ۱۶ دسمبر کی تاریخ فیصلہ کے لئے رکھی۔

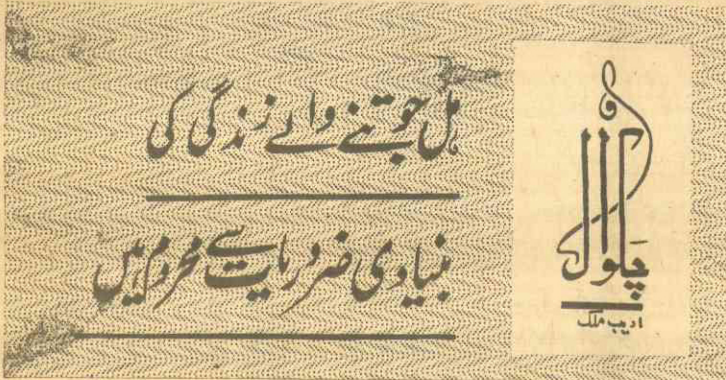
۱۴ دسمبر کو فیصلہ ہونے والا تھا اور ۱۳، ۱۴ دسمبر کی درمیانی رات کو وڈیرہ شمس الدین نے موقعہ دیکھ کر ہاری علی محمد کھوکھر کو ختم کرنے کے لئے مبینہ طور پر قاتلانہ حملہ کر دیا۔ جب سے ہاریوں نے ٹربیونل میں کیس داخل کیا ہے۔ وڈیرہ نے ہاریوں کا جینا حرام کر رکھا ہے۔ نہ کھانے کو اناج دیتے ہیں نہ جانوروں کے لئے چارہ۔ اب تک ہاری اپنا اور جانوروں کا پیٹ پالنے کے لئے اپنے آدھے سے زیادہ جانور فروخت کر چکے ہیں۔

کتنی دفعہ ہاریوں کو زد و کوب کیا گیا اور قتل کرنے کی دھمکیاں دی گئی ہیں، ہاریوں نے پولیس میں رپورٹیں داخل کیں۔ مگر پولیس نے انہیں جان و مال کا تحفظ نہیں دیا۔ ایک درخواست تو خود بھٹو صاحب کے دستخطوں سے ڈی۔ سی اور ایس۔ پی کے ہاتھوں ہوتی ہوئی پولیس تھانہ کنری میں عرصے سے پڑی ہے مگر کوئی اقدام نہ کیا گیا۔ بلکہ پولیس نے ہاریوں سے کہا کہ بھٹو کے لکھ دینے سے کیا ہم وڈیرے کو گرفتار کر لیں۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔

پولیس نے کیس داخل کر لیا ہے مگر اب تک وڈیرہ شمس الدین کو گرفتار نہیں کیا گیا کیونکہ اس نے ضمانت قبل از گرفتاری کرالی ہے شمس الدین کی گرفتاری سے پولیس کی آمدنی اور دوسرے وڈیروں کی خوشنودی دونوں ختم ہو جائیں گی۔

آج کل جبکہ ہاری اپنی بپتا میں پڑے ہوئے ہیں وڈیرہ نے گوٹھ میں کچھ بدمعاش بلا رکھے ہیں جن میں کچھ ہسٹری شیٹر ہیں یہ افراد ہر وقت رائفلوں اور کلہاڑیوں سے مسلح گاؤں میں گشت کر کے ہاریوں اور ان کے بال بچوں کو خوفزدہ کر رہے ہیں۔ اور کسی بھی وقت ان کی موجودگی سے کوئی بڑا ہنگامہ کھڑا ہو سکتا ہے جس میں مظلوم ہاریوں کی جان بھی جا سکتی ہے۔





ہل جوتنے والے ملک کی ریڑھ کی ہڈی کا اثمر رکھتے ہیں اس میں کسی قسم کے شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے۔ یہی وہ لوگ ہیں جو کھوپڑی کو جلا دینے والی گرمی اور خون کو منجمد کر دینے والی سردی میں زمین کا سینہ چیر کر اُسے زر و جواہر اُگلنے کے قابل بناتے اور شب و روز ایک کر کے مہذب شہریوں کے لئے منڈیوں میں خام اجناس کے ڈھیر لگا دیتے ہیں۔ خود بھوکے رہتے ہیں کہ اوروں کو کھلائیں، خود ننگے رہتے ہیں کہ دوسروں کو پہنائیں۔ گزشتہ برسوں کی مسلسل خشک سالی اور گرانی نے اہلِ دیہات کی زندگی مفلوج بنا دی ہے۔ گرانی کے گراں بار ہتھوڑوں نے ہل جوتنے والوں کی ریڑھ کی ہڈی توڑ دی ہے۔ زندگی کی مشکلات سے گھبرا کر شہری سہولتوں کی تلاش میں اہلِ دیہات شہروں کا رُخ کر رہے ہیں شہروں میں کاروبار اور دولت کی ریل پیل اور عام گہما گہمی اہلِ دیہات کے دلوں کو بھی اِدھر برابر کھینچے جا رہی ہے۔ حکومت کی نوازشات شہریوں پر زیادہ ہیں۔ اس وقت شہریوں کو سرکاری ڈپوؤں کے ذریعے آٹا، گھی اور چینی مقررہ دلموں پر باقاعدگی سے مل رہی ہے۔ مگر اہلِ دیہات اس سہولت سے قطعاً محروم ہیں۔ آٹا چھٹانک کے حساب سے، گھی اور چینی تولے ماشوں کے حساب سے انہیں مل رہی ہے۔ ان تولوں ماشوں کے لئے بھی راشن ڈپوؤں پر دھکے کھانے، اور ڈپو ہولڈروں کی جھڑکیاں برداشت کرنا پڑتی ہیں۔ حالت یہ ہے کہ اہلِ دیہات کو اشیائے صرف کی گرانی کا ناگ ہی نہیں ڈس رہا بلکہ نایابی کا عفریت انہیں بن سوچے ہی نگل رہا ہے۔ شرفا پیسے ہاتھ میں لئے کوچہ پیمائی کرتے پھرتے ہیں۔ غریب لوگ دربدر مارے مارے چکر کاٹ رہے ہیں۔ آٹا ملتا ہے تو دال نہیں ملتی بچے اور مریض کے لئے تولہ بھر چینی میسر نہیں۔ گھروں میں ہو کا عالم ہے۔ دیہات کی زندگی کا خاکہ ان لفظوں میں پیش کیا جا سکتا ہے۔ پیٹ ہے خالی، ہونٹ ہیں خشک اور آنکھ ہے تر۔

چکوال تحصیل کے ڈپو ہولڈروں نے بھی اپنے ایک اجلاس میں دیہاتوں کے کوٹہ میں معقول اضافے کا مطالبہ کیا تھا۔ مگر وہ آواز صدا بصحرا ثابت ہوئی۔ اگر یہ خیال کیا جائے کہ ڈپو ہولڈروں کے دلوں سے جو آواز نکلتی ہے وہ کاروباری اثرات میں ڈوبی ہوتی ہے۔ مگر دیہاتی بچوں، بڈھوں اور جوانوں کے لبوں سے نکلی ہوئی صداؤں کو اگر نہ پہچانا جائے اور ان کو مشرفِ قبول نہ بخشا جائے تو یہ بہت بڑا المیہ ہوگا۔ شہروں اور دیہاتوں میں امتیاز مساواتِ محمدی کی نفی کرتا ہے۔

سرما کی ضروریات کی فہرست بہت طویل ہے مگر

سرِ فہرست سوختنی لکڑی اور کوئلہ ہے۔ ہمارے وطن میں ہر چیز آگے اور اوپر ہی بڑھتی اور اٹھتی جاتی ہے۔ کوئلہ ایک روپیہ سیر، سوختنی لکڑی ہاتھ نہیں لگنے دیتی چھالہ کے نواحی دیہات اور جنگلات میں عام پائی جاتی ہے۔ رستے بھی ہموار ہیں۔ سرکاری جنگلات نیلام ہوتے ہیں۔ نالوں اور گھاٹیوں میں پھلاہی کے گھنے ذخائر ہیں کھیتوں اور پگڈنڈیوں پر بھی درخت پرے باندھے کھڑے ہیں۔ محکمہ جنگلات کے متعدد کارکن درخت لگوا بھی رہے ہیں، کٹوا بھی رہے ہیں۔ لکڑی سے لدے ہوئے اونٹ قطار اندر قطار آرہے ہیں۔ چھ چھ کنال کے ٹال لکڑی سے اٹے پڑے ہیں۔ آروں سے لکڑی کٹ رہی ہے۔ دساور کو جارہی ہے۔ چارسدہ اور پشاور کو جارہی ہے بھٹیوں اور بھٹوں میں جھونکی جارہی ہے۔ مگر صارفین کی قسمت میں ڈنڈے چھ روپے، نم بھری سات روپے اور آٹھ روپے شرفا کے لئے دس روپے من فروخت ہورہی ہے۔ محکمہ جنگلات اور ایندھن فروشوں کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ اگر محکمہ جنگلات تھوڑے منافع کے لئے ایندھن فروشوں پر زور دے تو کیوں؟ اور ایندھن فروش منافع کم لیں تو کیوں؟ ان کی ضرریاتِ زندگی دوسرے لوگوں سے کہاں کم ہیں؟ اب کے غریب لوگوں کے اللہ میاں نے باجرے اور جوار کے ٹانڈے اتنے فراواں کردیئے کہ وہ کمرے گرم کریں۔ چولھے اور تنور کو گرمی پہنچائیں آگ تاپیں، دھوپ کھائیں اور جسم پر بھبھوت رمائیں ضرورت پڑے تو چاچا امیر خان ایم این اے کے ہاں جائیں اور ان کے سامنے یہ نعرہ لگائیں۔ ساڈے وہڑے آ ویں تیندڑی مہربانی!

ملاوٹ کا کاروبار

تجارت آزادانہ ہوتی تھی۔ تاجر کی قدر و عظمت کے پیشِ نظر اکبر مرحوم کو بھی تاجر کے سر پر تاج پہنانا پڑا۔ تمام لوگ تجار کی عزت کرتے تھے۔ دیانتداری تاجروں کا شیوہ تھا۔ مگر آں قدح بشکست وآں ساقی نہ ماند۔ اب تجارت بھی آمیزشی، اس کے رنگ ڈھنگ بھی "نخالص" یعنی دودھ میں پانی چلتا ہے آٹے میں مٹی چلتی ہے"۔ جس طرح بٹیریں پھانسنے کے لئے سرکی چلانی پڑتی ہے۔ اسی طرح اپنی دکان چمکانے اور گرم بازاری کے لئے تبلیغ کی ضرورت بڑھتی جاتی ہے۔ دس۔ پندرہ۔ بیس۔ پچیس فی صد کی کمیشن ٹھہرتی ہے۔ بھکشو علی کوچوں اور محلوں میں پھر پھر کر بگ جاتے ہیں۔ مساجد اور تعلیمی اداروں سے بھی آوازیں اٹھتی ہیں۔ مساجد اور مکاتب کا احترام تھا۔ مگر اب انہیں بھی اپنے اغراض مقاصد کے لئے استعمال میں لایا جارہا ہے۔ مولانا اور مسٹر برابر لپکا رہے ہیں۔ ہتھولیں پھولیں اتھو گھٹیں اتھو گھٹیں۔ سیاسی اور عقائد کے اختلافات نے انوکھی صورت اختیار کرلی ہے۔ فرقوں میں بٹے ہوئے تو تھے ہی، اب سیاسی، جماعتی عقائد اور گروہی اختلافات کاروبار پر بھی اثر انداز ہورہے ہیں۔ سر اختلافات باہمی کا جھگڑا تیز ہورہا ہے۔ اس کے آگے بڑے بڑے جغادری جھک رہے ہیں۔ تعلیمی ادارے جہاں ہر طبقہ اور عقیدہ کے طلبا حصولِ تعلیم کے لئے داخل ہوتے ہیں۔ ان کے کانوں میں تعصب کا زہر گھول گھول کر ڈالنا۔ اور ان کو ابتدا ہی سے بغض و کینہ کے خارزاروں میں دھکیلنا قابلِ نفرت ہے۔ مساجد اور مکاتب کو تجارتی اور سیاسی اکھاڑہ بنادیا گیا ہے۔

کیمبل پور، شاہدہ پروین

"لنگر" میں کسانوں کی عوامی کمیٹی کا قیام!

کیمبلپور پاکستان کا پسماندہ ترین ضلع ہے۔ جاگیردار یہاں اسکول قائم نہیں ہونے دیتے۔ جس کی وجہ سے ۹۰ فیصد آبادی ان پڑھ ہے۔ بیشتر آبادی کا پیشہ کھیتی باڑی ہے۔ زمین جاگیرداروں کی ملکیت ہے۔ کسان کی حیثیت کھیت مزدور کی سی ہے۔ اس لئے ہر گھر کا کوئی نہ کوئی فرد ضرور فوج میں ہے۔ تمام ضلع کی زمین صرف چند جاگیردار خاندانوں کے قبضے میں ہے۔ جو طبقاتی اعتبار سے اتنے ہی ظالم ہیں۔ جتنے کسی بھی علاقے کے جاگیردار ہوسکتے ہیں۔ "دھریک کی سردار فیملی" ظلم و تشدد میں انفرادی حیثیت کی مالک ہے۔ اس خاندان کا ایک ایک آدمی کئی کئی گاؤں کا مالک ہے۔ ہر ایک اپنے علاقے کا "نواب کالاباغ" ہے، بلکہ انکے مظالم "نواب کالاباغ" سے بہت بڑھے ہوتے ہیں۔

کسان سارا سال محنت کرتے ہیں، کھیتی باڑی کرتے ہیں۔ سردار سارا سال عیاشی کرتے ہیں۔ کتے لڑاتے ہیں اور شکار کھیلتے ہیں۔ فصل پکنے پر ان کے کارندے فصل کا بڑا حصہ اٹھا کر لے جاتے ہیں، اور کسان خالی ہاتھ رہ جاتا ہے۔

یوں تو سب سردار ظالم ہیں۔ لیکن ایک سردار جو "لنگر" "زندی" "کوٹ" اور "مقام" کا مالک ہے۔ سب سے بازی لے گیا ہے اور اس ظلم کے خلاف لنگر کے علاوہ کہیں بھی جدوجہد نہیں ہوتی۔ البتہ لنگر گاؤں میں کسانوں کی تحریک منظم ہے۔

لنگر کے علاوہ یہ سردار ہر کسان گھرانے سے سال میں ایک مرتبہ ایک بکری، ایک مرغی، گھی اور انڈے بطور ٹیکس وصول کرتا ہے۔ اس کے علاوہ اگر کسی مزارع کا جانور سردار کی "رکھ" میں گھس جائے تو اس کے مالک پر ۵۰ سے ۱۰۰ روپیہ تک جرمانہ کیا جاتا ہے۔ عدم ادائیگی کی صورت میں جانور ضبط کرلیا جاتا ہے۔ اگر کوئی کسان مویشی ہانکنے کے لئے چھڑی سردار کی رکھ سے کاٹ لے تو اس پر بھی ۱۰۰ روپیہ جرمانہ کیا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ بڑی ہوکر یہ چھڑی ضرور شہتیر بنتی، لہٰذا اس کی صحیح قیمت ۱۰۰ روپیہ ہی ہے۔

سرکاری جنگل سے لکڑیاں کاٹ کر اپنا پیٹ پالنے والے ماچھیوں کو محکمہ جنگلات کے افسران کے علاوہ سردار کو بھی ٹیکس ادا کرنا پڑتا ہے۔ سردار کے نوکر شاہی سے تعلقات ہیں۔ تھانیدار تھانہ میں آنے سے پہلے اس کی قدم بوسی کے لئے حاضر ہوتے ہیں۔

لنگر اس ظلم و تشدد کے علاقے میں کسان بیداری کا روشن مینار ہے۔ لنگر کے کسانوں نے ایوب کے عہد سے بھی پہلے جدوجہد کا آغاز کردیا تھا۔ اور آج بھی مصروفِ جدوجہد ہیں۔ اگرچہ ارد گرد کے دیہاتوں نے کھل کر لنگر کے کسانوں کا ساتھ نہ دیا لیکن ان کی ہمدردیاں ہمیشہ اپنے طبقاتی ساتھیوں کے ساتھ رہیں۔

لنگر کی کسان تحریک کو شروع ہی سے دبا دینے کی کوشش کی گئی۔ بے شمار کسانوں کو بے دخل کیا گیا، پیٹا گیا۔ لیکن اس طرح تحریک دبی نہیں بلکہ کسانوں میں اتحاد اور مضبوط ہوگیا۔ ایوب خان کے زمانے میں کسان رہنما علی خان کو دن دہاڑے شہید کردیا گیا۔ جاگیرداروں کا خیال تھا کہ اس طرح وہ کسان تحریک کو کچلنے میں کامیاب ہوجائیں گے، لیکن کسانوں کا اتحاد اور مضبوط ہوگیا۔ کسان علی خان کی شہادت سے دل برداشتہ نہیں ہوئے بلکہ انہوں نے

علی خان کی شہادت کو جدوجہد کی علامت بنالیا۔

کسانوں کا سیاسی شعور بیدار ہوتا جارہا ہے۔ اُنہوں نے عمر رسیدہ اور بزرگ کسانوں پر مشتمل ایک عوامی کمیٹی بنائی ہے جو آپس میں زمین کے جھگڑوں سے لے کر شادی بیاہ تک کے مسائل کو حل کرتی ہے۔ "لنگر" کے کسانوں کے آپس کے مسائل کبھی کچہری تک نہیں جاتے۔ سردار کے خلاف مقدمات کی پیروی عوامی کمیٹی کے ذمے ہے۔ جس کے اخراجات عوامی چندہ سے پورے کئے جاتے ہیں۔ یہاں پر اگر کسی کسان کو بے دخل کر دیا جائے۔ تو کوئی دوسرا اس زمین کو کاشت کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتا اور نہ ہی دوسرے گاؤں سے کسی شخص کو اس بات کی اجازت ہے کہ وہ یہاں آکر زمین کاشت کرے آپس کے لین دین کمیٹی کے سامنے ہوتے ہیں جن کیلئے رسید اور تحریر کی ضرورت نہیں ہوتی۔ آج تک کسی کسان نے کمیٹی کے فیصلے سے ذرا بھر بھی اختلاف نہیں کیا۔

لنگر میں کسان ساتھیوں کی اس کامیابی کو دیکھ کر اب دوسرے علاقوں میں بھی کسانوں نے جدوجہد شروع کر دی ہے۔ مختلف علاقوں میں ہر روز کوئی نہ کوئی واقعہ ہو جاتا ہے جو عوامی بیداری کا ثبوت مہیا کر رہا ہے۔

دوڑ

برسات میں گرلز اسکول بند کر دیا گیا

دوڑ میں طالبات کے لئے صرف ایک پرائمری اسکول ہے۔ جسمیں دوسو طالبات تعلیم حاصل کرتی ہیں۔ اس اسکول کی عمارت انتہائی خستہ حالت میں ہے اور ہر وقت اس کے گرنے کا خطرہ رہتا ہے۔ بارش کے موسم میں اسکول کو مجبوراً بند کرنا پڑتا ہے۔ حکومت نے اسکول کی مرمت کے لئے چوبیس ہزار روپے منظور کئے ہیں۔ لیکن ابھی تک مرمت کا کام شروع نہیں ہوا معلوم نہیں کہ اس سلسلہ میں کیا رکاوٹیں حائل ہیں۔ محکمہ تعلیم کو اس طرف بارہا متوجہ کیا گیا۔ لیکن ابھی تک کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔ محکمہ تعلیم کو اس طرف توجہ دینی چاہیئے۔ تاکہ طالبات سکون اور یکسوئی کے ساتھ تعلیم حاصل کر سکیں۔

اس کے علاوہ یہاں مڈل کے بعد طالبات کے لئے مزید تعلیم حاصل کرنے کا کوئی انتظام نہیں ہے محکمہ تعلیم کے حکام نے یقین دہانی کرائی تھی۔ کہ جلد ہی مقامی مڈل اسکول میں نویں کلاس کی منظوری دی جائے گی۔ لیکن ابھی تک اس کے کوئی آثار نہیں پائے جاتے ہیں۔

دوڑ کے شہریوں اور طلبہ و طالبات نے ریلوے کے اعلیٰ افسران سے اپیل کی ہے کہ دوڑ میں عوامی ایکسپریس ٹھہرائی جائے۔ کیونکہ طلبہ و طالبات جو نواب شاہ کے کالجوں میں تعلیم حاصل کرنے کے لئے صبح جس گاڑی سے جاتے ہیں۔ وہ بعض اوقات اتنی جلدی سے چلی جاتی ہے کہ کسی کو علم تک نہیں ہوتا اور بعض اوقات اتنا لیٹ ہوتی ہے کہ انتظار کرتے کرتے ٹانگیں تھک جاتی ہیں۔ اس پریشانی سے نجات دلانے کے لئے دوڑ میں عوامی ایکسپریس کو ٹھہرایا جائے۔ تاکہ طلباء و طالبات وقت پر کالج اور اسکول پہنچ سکیں۔ بچیری اور باندھی شہر میں پولیس تھانہ نہ ہونے سے شہریوں کو شدید پریشانی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ بچیری اور باندھی کے شہریوں نے حکومت سندھ سے اپیل کی ہے کہ بچیری اور باندھی میں پولیس تھانہ قائم کیا جائے۔

دوڑ سے رضا آباد جانے کے لئے ریلوے لائنیں کراس کرنی پڑتی ہیں۔ یہاں اسٹیشن پر پل ہے۔ جو صرف دو لائنوں کے اوپر بنا ہوا ہے۔ رضا آباد سے آنے والے طلبہ و طالبات کو بڑی پریشانی ہوتی ہے کیونکہ تیسری لائن پر کوئی نہ کوئی مال گاڑی کھڑی رہتی ہے محکمہ ریلوے کو اس طرف توجہ دینی چاہیئے۔ اور تیسری لائن پر پل تعمیر کیا جائے۔

دوڑ تجارتی لحاظ سے ضلع نواب شاہ کا اہم شہر ہے۔ ضلع نواب شاہ کے لوگ دوڑ کو نواب شاہ کا بڑا بیٹا کہتے ہیں۔ دوڑ کے ٹیلیفون ایکسچینج میں صرف ایک ٹرنک لائن ہے۔ جس میں کالوں کا رش رہتا ہے اسکے علاوہ دوڑ اور پڈعیدن کے درمیان گذشتہ تین سال سے ٹیلیفون کا رابطہ منقطع ہے۔ اس سلسلے میں کئی بار متعلقہ حکام کو متوجہ کیا گیا لیکن ابھی تک کوئی خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔ نواب شاہ براستہ سٹھ میل دوڑ تک آنے والی سڑک کی حالت انتہائی خراب ہوگئی ہے۔ اس سڑک پر جا بجا گڑھے پڑے ہوئے ہیں جس کی وجہ سے بسوں میں بہت دھچکے لگتے ہیں۔ لوگوں کی دشواری کے پیش نظر مذکورہ سڑک کی مرمت کرائی جاتے۔

یہاں عزیب آباد کے علاقہ میں صفائی کا معقول انتظام نہ ہونے کی وجہ سے پورا علاقہ مچھروں اور مکھیوں کی آماجگاہ بنا ہوا ہے۔ جس سے وبائی بیماریوں کے پھیلنے کا اندیشہ ہے۔ متعلقہ حکام کو چاہیئے کہ صفائی کے معقول انتظام کے لئے ضروری اقدامات کریں۔

بقیہ

مشرق وسطیٰ، عالمی طاقتیں اور یورپ

سوویت پالیسی "خوف کا شکار ہے"۔ حالات ڈیگال اور پامپیدو کی پرانی وارننگ کو صحیح ثابت کر رہے ہیں۔ کہ دونوں بڑی طاقتیں اپنے آپ کو سمجھائے بغیر — دنیا کو آپس میں تقسیم کر لیں گے۔

اپنے مفادات سے قطع نظر، مغربی یورپ کے ممالک مشرق وسطیٰ کے سوال پر دونوں بڑی طاقتوں کی مخصوص سرگرمیوں کو ختم کرنے کی کوششیں کر رہے ہیں، اور مشرق وسطیٰ کے معاملات میں تندی سے حصہ لینے کیلئے راہیں تلاش کر رہے ہیں۔ ای، ای، سی کے نو ممالک کے وزراء خارجہ کے مشترکہ اعلان میں اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ نو ممالک کی حکومتیں مشرق وسطیٰ کے معاملات میں اپنا "کردار" ادا کرنے کو تیار ہیں۔ برطانیہ اور فرانس نے اقوام متحدہ کی فائر بندی کی معائنہ کمیٹی میں اپنی شمولیت سے دلچسپی کا اظہار زور و شور سے کیا ہے۔ مغربی یورپ کے ممالک کے نقطۂ نظر سے اس کی وجہ یہ ہے کہ فوجی اہمیت کا مشرق وسطیٰ کا علاقہ اُن کے مفادات کیلئے جغرافیائی اور دوسرے اعتبار سے اوّلین حیثیت رکھتا ہے۔ مغربی یورپ کا مشرق وسطیٰ کے تیل پر انحصار کسی بھی بڑی طاقت کے اعتماد پر سبقت لے گیا ہے مغربی یورپ کے زیادہ تر ممالک میں اُن کی تین چوتھائی توانائی تیل پر انحصار کرتی ہے۔ اور مغربی یورپ کا ۸۰ فیصد تیل مشرق وسطیٰ اور شمالی افریقہ سے آتا ہے۔

مغربی یورپ خوف کھاتا ہے کہ کہیں مشرق وسطیٰ روس کے حلقۂ اثر میں نہ آجائے، جہاں تک توانائی کا تعلق ہے، روس اُس پر دباؤ رکھتا ہے اور اس حالت میں ہے کہ عظیم فوجی اہمیت کے بازو کے ذریعے اُن کی سلامتی کو خطرے میں ڈال سکے۔ فرانسیسی اخبار L'AURORE نے ۲۹ر اکتوبر کو ایک مضمون میں کہا کہ "روس مشرق وسطیٰ کے محاذ پر اپنے دستے بھیجنا چاہتا ہے اور" دنیا کے اس علاقے پر قدم جمانے کی ضد، روس کی غیر معتدل خواہشات کو پردے میں رکھتی ہے"۔ مضمون نگار آگے چل کر کہتا ہے، روس نہ صرف "عرب کے تیل پر کنٹرول" چاہتا ہے بلکہ وہ یورپ پر اپنا تسلط بھی جمانا چاہتا ہے۔ "جو مشرق وسطیٰ کی سپلائی کے رحم و کرم پر ہے"۔ برطانیہ کا فنانشیل ٹائمز مشرق وسطیٰ میں روس کی پالیسی کے بارے میں

اظہارِ خیال کرتے ہوئے کہتا ہے کہ اُسے اپنی پوزیشن کو مستحکم بنانا ہے تاکہ فوجی اثر کو بڑھا سکے اور تیل کے مسئلے پر مغرب سے لڑ سکے جو اُس کی "طویل المیعاد حکمتِ عملی" ہے۔ لندن ٹائمز اپنے ۸ اکتوبر کے اداریے میں زور دیتے ہوئے لکھتا ہے: "فوجی اور اقتصادی دونوں اعتبارات سے مشرقِ وسطیٰ ایک اہم علاقہ ہے جسے ہم کسی غیر دوستانہ یا مخفی طور پر غیر دوستانہ طاقت یعنی روس کے تسلط میں نہیں دیکھ سکتے۔"

مشرقِ وسطیٰ کے بارے میں امریکہ کا طرزِ عمل بھی مغربی یورپ کے ممالک کو پریشان کرتا ہے۔ امریکی، سرکاری ذرائع نے یہ بات ظاہر کی ہے کہ ماسوائے پرتگال کے اُن میں سے کسی بھی ملک نے اسرائیل کیلئے امریکہ کے ہتھیاروں سے بھرے طیاروں کو اپنے علاقے پر اُترنے یا پرواز کرنے کی اجازت دینے سے انکار کر دیا۔ مغربی جرمنی نے امریکہ کو اپنی بندرگاہیں دینے سے انکار کر دیا۔ جہاں وہ اسرائیل کے لئے جہازوں کو لوڈ کرنا چاہتا تھا۔ ای، ای، سی کے نو ممالک کے وزرائے خارجہ نے نومبر کے شروع میں ایک مشترکہ بیان میں اسرائیل کو کہا کہ "وہ اپنے علاقائی تسلط کو ختم کرے جو اُس نے ۱۹۶۷ء کے تصادم کے بعد سے برقرار کر رکھا ہے"۔ اور مطالبہ کیا کہ "فلسطینیوں کے جائز حقوق کو بھی زیرِ بحث لایا جائے"۔ لندن کا ڈیلی ٹیلیگراف کہتا ہے: "یہ حقیقت ہے کہ مغربی یورپ اپنے ۸۰ فیصد تیل کے لئے مشرقِ وسطیٰ کے ذخائر پر بھروسہ کرتا ہے، اور عربوں نے اُسکا کمزور پہلو جان لیا ہے جو اُس کی زندگی کا سب سے بڑا عنصر ہے۔"

فوری ضرورت

مشرقِ وسطیٰ کے موجودہ حالات سے سبق حاصل کرتے ہوئے مغربی یورپ کے ممالک اِس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ بڑی طاقتوں کی سیاست میں حصہ لینے کے لئے، مغربی یورپ کی فوری ضرورت یہ ہے کہ یورپی برادری کے اتحاد کو مضبوط کریں تاکہ اپنے مفادات اور مغربی یورپ کی سلامتی کا دفاع کر سکیں اور بین الاقوامی امور میں اپنی آواز مؤثر بنا سکیں۔

مغربی یورپ کے کچھ اخباروں نے تبصرے کئے ہیں کہ کس طرح مغربی یورپ کے سیاسی اتحاد اور دفاع کو مستحکم کیا جا سکتا ہے۔ فرانسیسی اخبار لی مانڈے میں ۱۵ نومبر کو سابق وزیر البن چلنڈن کا ایک مضمون شائع ہوا جس میں اُنہوں نے کہا: "یورپ کی فوجی اور سیاسی تعمیر کا مسئلہ پہلے سے کہیں زیادہ مقدم حیثیت اختیار کر گیا ہے"۔ مغربی یورپ جس صورتحال سے مقابلہ کر رہا ہے اُس کا تجزیہ کرتے ہوئے مضمون نگار کہتا ہے۔ "ہم امریکہ کی دھمکی کے مقابلے میں روس کی دھمکی سے زیادہ خائف ہیں"، "سوویت یونین" روس کی زمین فضا اور سمندر پر خطرناک فوجی طاقت بنتا جا رہا ہے اور دنیا میں متواتر اپنا اثر بڑھا رہا ہے۔ مشرقی یورپ اُسکے قدموں میں ہے، بحراوقیانوس، مشرقِ قریب اور ایشیا میں موجودگی اور اب مغربی یورپ پر اُس کی نظر ہے"۔ اس دھمکی پر قابو پانے کے لئے مضمون نگار لکھتا ہے کہ مغربی یورپ کو اب بھی "امریکہ پر بھروسہ کرنا پڑیگا"۔ اس کے ساتھ ساتھ اُسے یہ تسلیم کرنا چاہیئے کہ "یورپ کا سیاسی اتحاد ــ دوسرے معنوں میں مشترکہ حکمتِ عملی اور دفاع ہے۔"

لندن ٹائمز کے ۹ نومبر کی اشاعت میں سابق وزیر لارڈ چالفونٹ کہتے ہیں کہ "مغربی یورپ کو پہلے کے مقابلے میں دفاع اور خارجہ پالیسی کے مسئلوں پر زیادہ شدت اور قابلیت سے کام کرنا چاہیئے۔ کچھ عرصے تک یورپ کے لئے امریکہ پر انحصار برقرار رہے گا"۔ مضمون نگار آگے چل کر لکھتا ہے "لیکن مغربی یورپ کے ممالک کو اپنے دفاع اور سلامتی کے لئے آپس میں مضبوط اتحاد کرنا چاہیئے"۔ مغربی جرمنی کے اخبار DENTSCHE ZEITUNG میں ۹ نومبر کو ایک مضمون چھپا جس میں کہا گیا تھا کہ مشرقِ وسطیٰ کے بحران نے "مغربی یورپ کی مشترکہ خارجہ پالیسی کا مطالبہ اٹھایا ہے"۔ یورپی برادری کو دفاع کے لئے "امریکہ سے ٹھوس حمایت کی ضرورت ہے"۔ لیکن مضمون میں اس بات پر خاص طور پر زور دیا گیا ہے کہ مغربی یورپ کو "خودمختار دفاع کے نظریے" پر کام کرنا چاہیئے۔

بقیہ، ٹی وی اور یحییٰ خاں

وزیرِ اطلاعات و نشریات سے پہلے بھی مطالبہ کرتے رہے ہیں کہ ٹیلی ویژن اور ریڈیو میں تطہیر کی جائے۔ موقع پرست کارکنوں کی وجہ سے یہ ادارے بے مقصد ہو کر رہ گئے ہیں۔ ایسے لوگ کسی وقت بھی کوئی ہنگامہ کروا سکتے ہیں، ویت نام کے سلسلے میں فلموں میں اکثر امریکی نقطۂ نظر تو پیش کیا ہی جاتا ہے۔ لیکن کوئی پوچھنے والا ہے نہ ٹوکنے والا۔

بقیہ،

اورنگی ٹاون پر غنڈوں کی حکومت

تین روپے بچ جائیں اور انہیں گھنٹوں کی پریشانی سے بھی نجات مل جاتے۔

گندے پانی کی نکاسی کا غلط نظام

نکاسی آب کے غلط نظام سے جگہ جگہ گندہ پانی گڑھوں میں جمع ہو جاتا ہے جس میں مچھر، مکھیاں اور جراثیم کی افزائش نسل ہوتی ہے۔ بارش کے دنوں میں چونکہ پانی کی نکاسی کا انتظام نہیں ہے اس لئے پورا علاقہ دلدل بن جاتا ہے۔ مکانات اور جھگیوں میں پانی بھر جاتا ہے ضرورت اس بات کی ہے کہ نکاسی آب کے نظام کو بہتر بنایا جائے۔

روزگار کی عدم فراہمی

بے روزگاری، بھوک اور غربت اس علاقے کے باشندوں کو دیمک کی طرح چاٹ رہی ہے۔ مشرقی پاکستان سے آنے والے محبِ وطن لوگوں کی وجہ سے اس میں مزید اضافہ ہو گیا ہے، پہلے تو سر چھپانے کی جگہ نہیں ملتی، اگر جگہ مل جاتی ہے تو غنڈے پریشان کرتے ہیں اور جب ان سے دو گھڑی کی فرصت ملتی ہے تو غمِ روزگار انہیں آن گھیرتا ہے، جماعت اسلامی اور دوسری سیاسی جماعتیں اس موقع سے فائدہ اٹھا کر انہیں ایکسپلائٹ کرتی ہیں لیکن وہ انہیں روزگار کے وسائل مہیا نہیں کرتیں، جماعت اسلامی کے کارکن گھوم گھوم کر ان کے اذہان میں زہریلا مواد بھرتے ہیں اور انہیں الٹی سیدھی ترکیبیں بتا کر اپنا الّو سیدھا کرتے ہیں۔ علاقہ کی آبادی جماعت اسلامی یا کسی جماعت کی مطلق ہمدرد نہیں ہے۔ لوگ موجودہ حکومت کے ہمدرد ہیں لیکن وہ مسائل کا حل چاہتے ہیں۔ زندہ رہنے کے لئے روزگار کا سہارا ڈھونڈ رہے ہیں، ان کے پاس اتنے پیسے بھی نہیں ہیں کہ وہ کسی چھوٹے موٹے کاروبار سے اپنا اور اپنے بچوں کا پیٹ پال لیں۔ اس لئے حکومت سے توقع کرتے ہیں کہ وہ ان کی روٹی کا کچھ نہ کچھ بندوبست کرے گی۔ اور کچھ ایسی تجاویز اور ٹھوس منصوبوں پر عمل کرے گی جس سے یہاں کی غریب اور مظلوم آبادی کو کم از کم زندہ رہنے کے مواقع میسّر آ جائیں گے۔

Regd No : S - 2772
Weekly "Al - Fatah" Karachi

17 - 24 JAN, 1974

